اردو شاعری میں
ہندو تہذیب کی عکاسی
اثر انصاری
ناشر
اظہر انصاری کوپا گنج مئو

اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی

اثر انصاری

کتاب ـــــــ اُردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی
مصنف ـــــــ اثر انصاری
کاتب ـــــــ مولوی مشتاق احمد پورنوی
مطبع ـــــــ
سن اشاعت ـــــــ ۲۰۰۱ء
قیمت ـــــــ ۵۰/- (پچاس روپئے)

تقسیم کار

نکھار پبلی کیشنز ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
- دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
- نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڈھ

اُردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکّاسی

اثر انصاری

عصرِ حاضر میں کہاں خاکِ چمن کی خوشبو
کب صبا لائے گی تہذیبِ کہن کی خوشبو

انتساب

ہندوستان کی مٹتی ہوئی مشترک تہذیب کے نام

اثر انصاری

دو باتیں

اثر انصاری کا شمار ان عظیم شاعروں میں ہوتا ہے جو اہل فن کی بارگاہ سے سند اعتبار حاصل کر چکے ہیں، ان کی شاعری میں زبان و بیان کے وہ تمام محاسن و کمالات اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں کہ نقادان فن بھی ان خوبیوں کو سراہنے پر مجبور ہیں، شاعری اس وقت ساحری بن جاتی ہے جب کہ زبان کے فنی رموز اس کے اندر سلیقے سے سموئے گئے ہوں، اور اس کے پیکر میں بلند اخلاقی قدروں کی روح متحرک ہو اور خوبصورت الفاظ کے دروبست میں نادر تخیلات کی جلوہ سامانی ہو، اس معیار پر دیکھا جائے تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اثرؔ صاحب کی شاعری عروج کی انتہا کو چھو رہی ہے اور کسی بھی داد و تحسین کی محتاج نہیں ہے۔

درد و سوز، فکر میں جدت، تخیل میں ندرت، بیان میں سلاست و وضاحت داخلی جذبات کی ہو بہو عکاسی، اور سیاسی و سماجی باتوں کی متوازن ترجمانی، شوخی و سنجیدگی کا حسین امتزاج، غزل کی قدیم سنجیدہ روایات کی شیرینیت اور جدید طرز فکر کو شبنمی پیراہن عطا کرنا اثرؔ انصاری کا ایسا امتیاز ہے کہ برملا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انھیں فن شاعری پر مکمل اقتدار چابکدستی اور سلیقہ مندی حاصل ہے۔

یہاں اثرؔ صاحب کی فنکارانہ وشاعرانہ حیثیت کا ہمہ جہتی تعارف مقصود نہیں اور نہ یہ موقع ہے، ان کی شخصیت پر اہل فن کے تبصرے بشکل تذکرہ شائع ہو چکے ہیں، مکمل تو نہیں مگر ایک حد تک تشفی کے لئے تذکرہ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

تمام اپنے فنی کمالات کے باوجود اثرؔ انصاری کی شخصیت شعروسخن یا علم وفن کی دنیا میں زیادہ مشہور و معروف نہیں ہے، میری معلومات کی حد تک اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ خود طبعی طور پر انتہائی منکسر المزاج، متواضع اور خاکسار واقع ہوئے ہیں، اور نام ونمود سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے ہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی ادباء و شعراء کی بین الاقوامی یا ملکی کسی تنظیم یا تحریک سے وابستہ نہیں رہے جہاں ایک نقطۂ بسیط کو بھی لہریں مارتا ہوا سمندر بنا کر پیش کیا جاتا ہے، اور اس تنظیم سے باہر بڑے سے بڑے قد آور فنکار بھی بونے نظر آتے ہیں اس لئے ہم اہل نظر کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ اثرؔ صاحب کو ان کے شعری مجموعۂ کلام اور نثری تخلیقات کے آئینے میں دیکھیں وہاں ان کی صحیح معرفت ہو سکے گی۔

کچھ ایسے پھول ہیں جن کو ملا نہیں ماحول
مہک رہے ہیں مگر جنگلوں میں رہتے ہیں

اثرؔ صاحب کے شعری مجموعے

۱۔ کم و کیف
۲۔ افکار پریشاں
۳۔ پیراہن گل
۴۔ زبان غزل
۵۔ آئینہ در آئینہ

نثری تخلیقات

۱ - سفرِ حج کے شب و روز

۲ - تذکرہ سخنوران مئو

۳ - دبستانِ شبلی کے نامور انشا پرداز

زیرِ نظر کتاب - "اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی" کی مثال مختلف چمن کے پھولوں کی ہے جن کو منتخب کر کے گلدستے کی شکل دیدی گئی ہے، اثر انصاری نے اس فکر کے ساتھ اس انتخاب کو پیش کیا ہے کہ قومی یکجہتی میں لسانی رشتہ کا رول بہت اہم ہوتا ہے، ہمارے ملک میں جب تک دو قومی نظریہ کو عروج نہیں ہوا تھا اس وقت تک ہندو مسلم شعراء ایک دوسرے کی مذہبی و تہذیبی پاکیزہ روایات کو اپنے شعری و نثری تخلیقات میں بڑے جذباتی انداز میں پیش کرتے تھے، مگر دو قومی نظریہ کی بنیاد پر جب سے ملک کی تقسیم وجود میں آئی، اس وقت سے تعصب کا عفریت برہنہ ہو گیا اور لسانی رشتہ کی کڑیاں بکھرنے لگیں اور قومی یکجہتی میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پاٹنا مستقبل قریب میں مشکل نظر آتا ہے۔

اردو رابطہ کی زبان تھی ہندو مسلم دونوں اس کی سبک روی اور شیریں و حسین لب و لہجہ کے شیدائی تھے اور اس کے نازک پیرہن میں اپنے خیالات کو پیش کر کے خود بھی محظوظ ہوتے تھے اور محظوظ کرتے تھے، اس طرح زبان اور قومی یکجہتی باہم گلے مل کر منزل کی طرف رواں دواں تھیں، مگر برا ہو تعصب کا کہ ملک کی تقسیم کے ساتھ اردو زبان بھی دو قومی نظریہ کے خنجر سے زخمی کر دی گئی جس کی کراہ کی کسک ہر ایسے ہوشمند نے محسوس کی جو ملک کی وحدت اور اکھنڈتا کو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کے آئینہ میں دیکھتا ہے، فرقہ پرستوں نے یہ باور کرانے کی ناکام کوشش کی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے

اس سے اسلامی تہذیب کی بو آتی ہے اس لیے اس کا بھارتیہ کرن ہونا چاہیئے، حالانکہ تاریخ کے اوراق اس فکر و نظر کے دیوالیہ پن پر شاہد عدل ہیں، ان ہندو مصنفین و شعراء کی لمبی قطاریں ہیں جنھوں نے اردو کو ترقی اور فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کیا ہے، ان کے قلم سے ہزاروں ایسی نثری و شعری تخلیقات منصۂ شہود پر آئی ہیں جن کے اوراق نعتیہ کلام، سیرت پاک، اسلامی کلچر، تاریخ اور اردو زبان و ادب کی زریں خدمات سے مزین ہیں، انھیں میں سے چند نامور لوگوں کے اسمائے گرامی قلمبند کئے جا رہے ہیں جن کی علمی و ادبی کاوشوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوگا کہ اردو کی زلف سنوارنے میں انھوں نے کیتی جگر کاوی سے کام لیا ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پنڈت سندر لال الہ آبادی، تلوک چند محروم، مالک رام، ستیہ پال آنند جمنا داس اختر، کرشن کمار ادیب، پریم پال اشک، اندر جیت لال، برج پریمی شیو پرشاد برگ، بسنت لکھنوی، بلراج کومل، ڈاکٹر پرکاش مونس، پریم گوپال متل، تیج بہادر بھان، پروفیسر گیان چند جین، پنڈت رتن ناتھ زتشی، دیوندر ستیارتھی، اوم کرشن راحت، رام لعل چھابڑہ، دھنپت رائے تھاپر، رانا گنوری کالی داس گپتا، ہرگووند دیال سریواستو، کمل جیت شرما، موتی لال رازداں، سالک لکھنوی، کنور مہندر سنگھ بیدی، سرور تونسوی، رادھا کرشن سہگل، منوہر لال کپور، ظفر پیامی، عابد پشاوری، ہنومان پرشاد شرما، نکو تونسوی، وغیرہ جیسے سیکڑوں سے زیادہ نام ہیں مگر طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آج ملک میں فرقہ پرستی کا دیو قومی یکجہتی کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے، پہلے سے زیادہ اس وقت ضرورت ہے کہ اکثریت و اقلیت کے رابطہ کی زبان اردو ہو، اور اردو کا سرمایہ جو ہمارے بزرگوں کی میراث ہے اس کی حفاظت کی جائے اور

اردو کو مزید فروغ دے کر قومی یکجہتی کے ستونوں کو مضبوط کیا جائے۔

اشرؔ انصاری صاحب نے بڑی جانفشانی کے ساتھ ہندو مسلم شعراء کے ایسے کلام کا انتخاب کیا ہے جس میں ہندو تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے، اب ایک ایسے انتخاب کی بھی ضرورت ہے کہ جس میں اسلامی تہذیب کی ترجمانی ہندو مسلم شعراء کی زبان و قلم سے کی گئی ہو، اس سے ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کی کڑیاں استوار ہوں گی، اور بدگمانیاں عقیدت و محبت سے بدلیں گی۔

شعری انتخاب کے ساتھ نثری انتخاب کی بھی ضرورت ہے، اردو زبان و ادب کے ہندو و مسلم مصنفین نے ایسا گنج گرانمایہ چھوڑا ہے کہ اگر جدید نسل کو اس سے آشنا کرایا جائے تو اردو کی وسعت آغوش میں فرقہ پرستی کا زہر تحلیل ہو کر تریاق کا کام کرے گا، دوریاں ختم ہوں گی، اور پیار و محبت کے شگوفے چٹکیں گے اور ہمارا بھارت مہان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گا۔

نثار احمد قاسمی ندوی

استاذ حدیث و عربی لٹریچر دار العلوم مئو

آئینۂ ترتیب

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

حرفِ آغاز

اردو زبان کا تخلیقی عمل غزنوی حکومت کے قیام، دسویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ لاہور اس وقت دارالحکومت تھا جہاں مختلف قومیں ترک، مغل، ایرانی و افغانی مقیم تھیں جو اہلِ ہند کے ساتھ ہر قسم کے تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی تعلقات قائم کرنے میں مصروف تھیں۔

برج بھاشا اور ہریانی زبان جو اس وقت پنجاب کے گرد و نواح میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اس کے الفاظ مسلمانوں اور اہلِ ہنود نے عربی، فارسی، ترکی و افغانی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ اپنی بول چال میں شامل کرنے کی کوششیں شروع کیں جس کے نتیجہ میں ایک نئی زبان وجود میں آنے لگی اور یہی زبان عہد بہ عہد نشو و نما پاتی ہوئی پہلے ہندوی کہلائی پھر تیرہویں صدی کے اوائل میں (عہد مغلیہ) ریختہ، جہانگیر کے دور میں دہلوی زبان، عہد شاہ جہانی میں اردوئے معلیٰ کہلاتی ہوئی بالآخر اردو کا نام اختیار کر کے ہندو مسلم تہذیب کی مشترک علامت بن گئی۔ لیکن افسوس! اس مشترک تہذیبی ورثہ کو ملک کی لسانی عصبیت نے بے اندازہ نقصان پہنچایا۔

جناب درگا سہائے سرورؔ نے اپنے قصیدہ کے گریز کے اشعار میں "اردو کی کہانی خود اسکی زبانی" پیش کیا ہے۔ نظم بہت لمبی ہے اور دلکش بھی۔ مختصراً ملاحظہ کریں ؎

یادگارِ عز و شانِ دولتِ اسلامیہ　　دلّی والی ہوں میں اردوئے معلّٰی کی دلہن

دورۂ اسلام میں تھا جو کبھی کرسی نشیں　　لوحِ اوراقِ زمانہ پر ہوں وہ نقشِ کہن

شاہزادی تھی کبھی دلّی کی میں اے بےخبر　　میرے سر پر چترِ شاہی تھا کبھی جلوہ فگن

مٹ گئے سب رفتہ رفتہ میری عظمت کے نشاں　　رہ گیا باقی فقط افسانۂ رنج و محن

وہ مرا ننھا سا سِن وہ جانفزا طفلی کے دن　　وہ شرارت وہ نزاکت وہ ادا وہ بانکپن

باتیں کرنا سیکھتی تھی بیگموں کی گود میں　　ڈھل رہا تھا حسن کے سانچے میں اندازِ سخن

اک طلسمِ نو کلیدِ شوخیِ تحریر تھی　　قفلِ ابجد بن کے کھل جاتا تھا چھوٹا سا دہن

جب ہوا بوٹا سا قد نشو و نما پا کر بڑا　　رکھ دیا سر پر فصاحت نے مرے تاجِ سخن

لے اڑی پردے سے باہر پھر تو شوخی حسن کی　　بن کے قصہ مختصر یاروں میں آئی میں دلہن

کچھ دنوں بارے رہی دلّی میں سرگرم نشاط　　جا کے چمکایا ہر اک محفل میں رنگِ انجمن

رفتہ رفتہ لکھنؤ کو پھر مرا چالا ہوا　　بن کے میکے سے گئی سسرال شرمیلی دلہن

نیچی نظروں نے کیا کتنے جوانوں کو شہید　　کر گئی کتنوں کو بسمل میرے گھونگھٹ کی پھبن

سر میں برسوں سے جو تھا جوشِ غزلخوانی بھرا　　آ کے چہکے حسن کے پھولوں پہ مرغانِ چمن

شاعروں نے ایشیائی طرز پر ڈھالا مجھے　　کر دیا اس پر ملمع تھا جو کندن سا بدن

زلف میں شانہ کیا کاجل لگایا آنکھ میں　　بھینی بھینی بدھیا پھولوں کی کیں زیبِ بدن

رُخ پہ گلگونہ ملا مہندی لگائی ہاتھ میں　　رنگ دیا رنگِ تصنع سے مرا سارا بدن

لوحِ ہستی پر بنا کر آہ میرا کالبد
رنگ بھر بھر کر بگاڑا پیکرِ حسنِ سخن

دکن میں اگرچہ اردو زبان وادب کا آغاز آٹھویں صدی ہجری میں ہو چکا تھا لیکن سولہویں صدی عیسوی کے بہمنی خاندان کے عادل شاہی دور میں اردو شاعری میں بہت کچھ نکھار پیدا ہو گیا تھا چنانچہ ولی دکنی اور سراج دکنی نے سب سے پہلے دہلوی زبان میں شاعری شروع کی' چونکہ اردو زبان ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی اس لئے اس زبان میں دونوں قوموں کے تہذیبی عناصر شامل ہو گئے۔

شاعری خواہ کسی زبان کی ہو اپنے ملک کے مذہبی و تہذیبی اثرات کے ساتھ اپنے طبعی اور جغرافیائی علامات کی نشان دہی ضرور کرتی ہے چنانچہ اردو زبان کی شاعری میں بھی یہاں کے ہندو مذہب' ہندو تہذیب اور ہندوستانی جغرافیائی اثرات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا تذکرہ نہ ہو۔ یہاں تک کہ اردو شاعری اپنے ابتدائی اور ریختہ گوئی کے دور میں ہندی پیراہن میں ملبوس تھی اور خالص ہندوانہ الفاظ کے استعمال سے اردو شاعری میں ہندو تہذیب کا عکس نمایاں طور پر جھلکنے لگا۔ خود ہندو اور مسلم قوموں کے مذاہب بھی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں جیسا کہ مولانا مسعود علی ندوی مرحوم 'الفرقان' کے شاہ ولی اللہ نمبر میں تحریر فرماتے ہیں کہ [۱]

"اسلام کے اس دیس (ہندوستان) پر ہزاروں احسانات ہیں اور اسکی روشن تعلیمات کے اثر سے یہاں کے ذہن میں تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ہندوستان میں اسلام جتنا بھی ہو اثر ہو سکا اس سے کہیں زیادہ خود متاثر ہوا ہے اور یہاں مسلمانوں نے

---

[۱] الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۱۹

جو زبان، تہذیب اور لباس اختیار کیے وہ سب ہندوانہ ہیں یا ہندو مسلم اشتراک کا نتیجہ ہیں۔"

مولانا موصوف نے ایک فرنچ مصنف از لوتون کی کتاب 'تمدن ہند' اردو ترجمہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا بیان نقل کیا ہے کہ [۱]

"اگر ہندوستان میں دین محمدی نے اپنے کچھ اثرات چھوڑے ہیں اور یہاں کے مذہب اور عقائد میں تبدیلی کی ہے تو اس سے زیادہ وہ خود یہاں کے تمدن اور مذہب سے متاثر ہوا ہے۔"

اس سلسلہ میں جناب گلزار زتشی دہلوی بھی اپنے مقالہ "مرثیہ گوئی میں قومی یکجہتی" کے زیر عنوان غیر اسلامی عناصر اور مشترکہ تہذیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ [۲]

"خسرو کے بعد رحیم و جائسی، کبیر، انشاء اور نظیر اکبر آبادی کے میلے ٹھیلوں، مندروں، مٹھوں، تیرتھ یاتروں، دیو مالائی ہندو روایات سے اپنے ادب کو مالا مال کرنے کی مثالوں سے لیکر دارا شکوہ تک کی وہ کوششیں شامل کیں کہ جب اسلامیات کے صحیفے اور نسخوں کو ہندی سنسکرت اور مقامی زبانوں میں اور بولیوں میں منتقل کیا گیا اور ویدانت گیتا، رامائن، مہابھارت، اپنشدوں اور پرانوں کو اردو فارسی اور عربی غزل میں ترجمہ کیا گیا۔"

آگے پھر کہتے ہیں کہ [۳]

---

[۱] تمدن ہند اردو ترجمہ ص ۱۵۵، [۲-۳] اردو مرثیہ گوئی مرثیہ شارب ردولوی ص ۲۷۳-۲۷۹

"مسلمان شعراء نے شیوجی، کرشن جی، رام چندر جی اور گنگا جمنا پر نظمیں کہنا شروع کیں اور بسنت تہوار کو درگاہوں میں رائج کیا تو دوسری طرف ہندوؤں نے حمد، نعت شریف، سلام و مرثیہ کی طرف توجہ کی اور قرآن حکیم کے سورتوں اور پاروں کا اردو نظم میں ترجمہ شروع کیا۔ بہادر شاہ ظفر نے رام لیلا اور دسہرے کے تہوار کو عوامی انداز میں سرکاری طور پر رائج کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں شادیاں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ مرنے جینے، شادی بیاہ، تیج تہوار، عیدین، ہولی دیوالی مشترکہ طور پر منائی جانے لگی۔"

یوں تو اردو شاعری میں ہر قسم کے ہندی الفاظ مستعمل ہیں، لیکن وہ خاص ہندی اور ہندوانہ الفاظ و عقائد جن کا تعلق ہندو مذہب، ہندو تہذیب و معاشرہ اور رسم و رواج سے ہے۔ انھیں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی مکمل عکاسی ہو سکے ورنہ اگر ہمیں ہندو مسلم دونوں کاربن کی مشترکہ ادبی کاوشوں کا جائزہ لینے اور اردو زبان کی شاعری کا ہمہ گیر تہذیبی حسن اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو بھی ہم صرف ایک ہی اردو مسلمان شاعر نظیر اکبر آبادی کے کلام سے ہندی الفاظ مصطلحات ہندوانہ عقائد ماقبل تاریخ کے مذہبی واقعات، رسم و رواج اور معاشرہ کے علاوہ ملک کے طبعی و جغرافیائی اثرات سب کچھ پیش کر سکتے تھے۔ لیکن مشترکہ سرمایۂ تہذیب کا سوال تشنۂ تکمیل رہ جاتا۔ بقول شاہ معین الدین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ادبی نقوش میں کہتے ہیں:

"یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں

حسن وعشق، رنج وغم، منظر نگاری اور واقعات نگاری جیسے موضوعات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں"

ان خصوصیات کو بھی اجاگر کر کے دیکھنا چاہیئے کہ مذکورہ بالا موضوعات کو ہندی الفاظ و مصطلحات کے ساتھ کس چابک دستی اور خوبصورتی کے ساتھ اردو شاعری کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

اثر انصاری

باب اوّل

مدیحِ خیر المرسلین

کتاب کا آغاز ہم اردو کے ایک مشہور نعت گو شاعر جناب محسنؔ کاکوروی کے نعتیہ قصیدہ سے کر رہے ہیں۔ محسنؔ کاکوروی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کم عمری ہی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے موصوف کو والہانہ محبت اور عقیدت تھی جس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے کہ ؎

ہے تمنا نہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر، نہ قطعہ، نہ قصیدہ نہ غزل

چنانچہ موصوف کی یہ تمنا پوری ہوئی اور انھوں نے ہمیشہ ہی نعتیہ کلام کہا۔ ذیل میں ہم جناب محسنؔ کاکوروی کا مشہور ترین نعتیہ قصیدہ "مدیحِ خیر المرسلین" پیش کر رہے ہیں۔ بغور دیکھئے کہ اس قصیدہ میں محسنؔ صاحب نے ہندی الفاظ ہندو معتقدات، مصطلحات کا استعمال کتنے خوبصورت انداز میں اردو شاعری میں کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نعتیہ قصیدہ (محسن کاکوروی)[1]

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل	برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل	رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل	جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی	کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی	ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
دُھر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ	ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی	پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
اب کے میلا بھی ہنڈولے کا تھا گرداب بلا	نہ بچا کوئی محافہ، نہ کوئی رتھ نہ بہل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا درشن کیوں کر	سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بے کل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں	تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے	نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے	بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں لیے گنگا جل
قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاجِ عالی	لالۂ باغ ہے ہندوئے فلک کھیم کسل
شاہدِ کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ	چشمِ کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت	یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے	برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
راجہ اندر ہے پری خانۂ مے کا پانی	نغمۂ مے کا سری کرشن کنھیا بادل

---

[1] کلیات نعت محسن کاکوروی ص ۲۵

شاخ پر پھول ہیں جنبش میں فلک پر سنبل | سب ہوا کھاتے ہیں گلشن میں سوار و پیدل
شاخِ شمشاد پہ قمری سے کہو چھیڑے ملار | نونہالانِ گلستاں کو سنائے یہ غزل

قصیدہ کی طوالت کی وجہ سے بہت سارے اشعار کو قلم انداز کرنا پڑا لیکن ان ہی مذکورہ بالا اشعار میں ہندی الفاظ، تشبیہات، تلمیحات اور معتقدات جنھیں ہندو تہذیب سے خاص لگاؤ ہے۔ بڑی خوبی اور فنکارانہ انداز میں استعمال کیے گئے ہیں۔ بلاشبہہ نعتیہ قصیدہ میں محسن کاکوروی کا ایک منفرد تجربہ ہے۔

جناب محسن کاکوروی کے نعتیہ کلام کے بعد جناب نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی طرف رجوع کیا جائے جو ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور معتقدات کے بہتیرے عنوانات و موضوعات پر مبنی کلیات کے سیکڑوں صفحات پر بکھری ہوئی ہیں ـــــ نظیر اکبرآبادی نہایت پُرگو اور قادر الکلام شاعر تھے جو ہندی، اردو، سنسکرت، پنجابی، عربی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ بلاشبہہ انھیں خالص ہندوستانی اور قومی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ انھیں ہندوستان کے ذرہ ذرہ سے پیار تھا۔ انھوں نے ہندو مذہب، ہندوانہ عقائد و تہذیب، ہندو معتقدات، رسم و رواج، تقریبات، ہندو میلے ٹھیلے کے علاوہ ہندو پیشواؤں کا تذکرہ اس والہانہ انداز اور عقیدت کے ساتھ کیا ہے جیسا ایک ہندو عقیدت مند ہی کر سکتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے بارے میں ایک شاعر نے سچ کہا ہے کہ ؎

ترے سخن میں ہے کیفیتِ شبِ مہتاب | ہر ایک مصرع جاں بخش ساغرِ مے ناب
نظر نواز ہزاروں نقوشِ حسنِ شباب | رہیگا نغمہ فشاں تیری شاعری کا رباب

وہ مے نہیں کسی خم میں جو تیرے جام میں ہے
مدام جسکی طلب بزم خاص و عام میں ہے

سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی کی ایک طویل نظم "موت کی فلاسفی" کے کچھ اشعار پر نظر ڈالی جائے جو خالص ہندوانہ لب و لہجہ میں کہی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے نظم

موت کی فلاسفی[1]

جو مرنا مرنا کہتے ہیں وہ مرنا کیا بتلائے کوئی   دا جو ہر پا ہیں کھول مرے سب اپنی اپنی چھوڑ دوئی
سی ڈالی آنکھ دورنگی کی جب یکرنگی کی مار سوئی   نہ مردوں کا غل شور رہا نہ عورت کی کچھ آہ اوئی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی

نقارہ ڈھول بجتا تھا اور کیا کیا تھی آدھیم کی جب پھوٹ گیا پھر دیکھو تو آواز سب اسکی کہاں گئی
نر مادہ دونوں ایک ہوئے جب آن بھرم کی کھال کھنچی   نہ نر کا کچھ نر مول رہا نہ مادہ کی پہچان رہی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی

ہر چار طرف اجیالی تھی اس تیل سکوری پانی کی   وہ جوت نہ تھی اس دیئے کی تھی اور کسی کی اجیالی
سب گھر کے بیچ اجالا تھا کیا نوک سدھی تھی نربھری   جب دیوا بجھ کر سرد ہوا پھر چھائے گئی کل اندھیاری

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی

تھا جب تک خاصہ دودھ بنا تھی کیا کیا اسمیں چتریمی   ابرق ملائی ماکھن تھا اور کھویا گاڑھا اور تری
جب پھٹ کر ٹکڑے دودھ ہوا پھر کہاں گئی وہ چکنائی   نہ دودھ رہا نہ دہی رہا نہ روغن مسکہ چھاچھ رہی

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی

یہ بات نہ سمجھے اور سنو جو مٹکی ڈالی پانی میں — وہ رستے میں جب پھوٹ گئی با تھو لگی کھینچا تانی میں
نہ راجہ کا سندیہہ رہا نہ بھید رہا کچھ رانی میں — جا گھیرے مل گئے گھیرے میں اور پانی مل گیا پانی میں

ماٹی کی ماٹی آگ اگن جل نیر پون کی پون ہوئی
اب کس سے پوچھیے کون موا اور کس سے کہیے کون موئی

مذکورہ بالا نظم کے چند بند جو پیش کئے گئے ہیں اس سے ہندوانہ لب ولہجہ کی پوری پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ اب نظیر اکبر آبادی ہی کی دوسری نظموں کا جائزہ معتقداتِ ہنود سے شروع کیا جاتا ہے جس کے ذیل میں بہت سارے موضوعات آئیں گے۔ ان کا الگ الگ تذکرہ دوسرے اکابرین کے ساتھ ساتھ کیا جائیگا۔

معتقدات مذہب ہنود

اس سلسلہ کی پہلی نظم کنھیا جی کا جنم ہے جو کافی طویل ہے اسکے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔ ابتدائی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے شاعر نے بتلایا کہ کنھیا جی اپنے ماموں راجہ کنشک کے عہد میں پیدا ہوئے جو نہایت ظالم اور جابر حکمراں تھا جو خود کنھیا جی کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ پیدائش کے ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے نظیر اکبر آبادی یوں کہتے ہیں [۱]

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے — اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات شبھا کی بولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے — آنند منڈیلے باجت ہیں نت بھون اجالا ہوتا ہے

---

[۱] کلیات نظیر صفحہ ۴۳۷

یوں نیک پُتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم

پران کے اور ہی پچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

سبھ ساعت سے یوں دنیا میں اوتار گرہن میں آتے ہیں　　جو نار دکھ ہے دھیان بھلی سب انکا بھید بتاتے ہیں

وہ نیک مہورت ہے جس دم اس شِشٹ میں جنم جاتے ہیں　　جو لیلا اُنکی ہوتی ہے وہ روپ یہ جا دکھلاتے ہیں

یوں دیکھنے میں اور کہنے میں وہ روپ تو بالے ہوتے ہیں

پر بالے پن ہی میں ان کے اپکار نرالے ہوتے ہیں

یہ بات کہی جو میں نے اب یوں اسکو تو اب دھیان لگا　　ہے پنڈت پستک بیچ لکھا تھا کنش جو راجہ متھرا کا

دھن ڈھیر بہت بل بیچ بڑے سامان انیک اور ڈیل بڑا　　گنج اور ترنگ اچھنے ٹیکے انباری ہووے زین بچھا

جب بن ٹھن اونچے ہستی پر وہ پالی آن نکلتا تھا

سب سنسار جھلا جھل کرتا تھا اور سنگ کٹکو دل چلتا تھا

اک روز جو اپنے بیچ بل پر وہ کنش بہت مغرور ہوا　　اور ہنس کر بولا دنیا میں ہے دوجا کون بھلا مجھ سا

اک بان لگا کر پربت کو چاہوں تو ابھی دوں پل میں گرا　　اس دیس کے جتنے ہیں ہے کون ہوئے جو مجھ سے سوا

جو شٹ کوئی آجدھ کرے کب ہوں پروا کا جور چلے

وہ سامنے میرے ایسا ہے جوں چیونٹی ہاتھی پاؤں تلے

وہ ایسے ایسے کتنے ہی جو بول گرڑھ کے کہتا تھا　　سب لوگ سبھا کے سنتے تھے کیا تاب جو بولے کوئی ذرا

تھا ایک پورکھ وہ یوں بولا تو بھولا اپنے بل پر کیا　　جو تیرا مارن ہارا ہے سو وہ بھی جنم اب لیوے گا

تو اپنے بل پر ہائے مورکھ اس آن عبث ہنکار کیا

وہ تجھ کو مار گرا دے گا یوں جیسے پھنگا مار لیا

کنھیا جی کے جنم سے پہلے کے حالات و واقعات معلوم ہو جانے کے بعد راجہ کنش کو

ڈر محسوس ہوا اور اسے معلوم ہو گیا کہ باسدیو کے گھر دیوکی رانی کو یہ بچہ پیدا ہونے والا ہے جو راجہ موصوف کو مار ڈالے گا۔ چنانچہ راجہ کنش نے باسدیو اور دیوکی رانی کو مندر میں بند کر دیا اور دروازوں پر پہرہ بٹھا دیا تاکہ انھیں پیدا ہوتے ہی مار ڈالے۔ ان حالات و واقعات کو جناب نظیر اکبر آبادی نے یوں نظم کیا ہے [1]

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو آئے گرب میں من موہن گوپال منوہر مرلی دھر سیکشن کشورن کنول نین
گھنشیام مراری بنواری گردھاری سندر سیام برن پربھو ناتھ بہاری کان للا سکھ دائی جگ کے دکھ بھجن

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کرشن کنھیا کی

تھا نیک مہینہ بھادوں کا اور دن بدھ گنتی آٹھن کی پھر آدھی رات ہوئی جس دم اور ہوا نچھتر روہنی بھی
سبھ ساعت نیک مہورت سے واں جنمے آکر کرشن جبھی اس مندر کے اندھیارے میں جو اور اجالی آن بھری

بسدیو سے بولیں دیوکی جی مت ڈر بھوسن میں گھبر کرو
اس بالک کو تم گوکل میں لے پہنچو اور مت دیر کرو

جو تم اسکو پہنچانے میں یاں ٹک بھی دیر لگاؤ گے وہ دشٹ اسے بھی ماریگا پچھتاتے ہی رہ جاؤ گے
اس آن سنبھل کر تم اسکو جو گوکل میں پہنچاؤ گے اس بات میں تم پھل پاؤ گے جو اسکی جان بچاؤ گے

واں گوکل باشی جو اسکو لے اپنی گود سنبھالے گا
کچھ نام وہ اس کا رکھ لے گا اور مہر و دیا سے پالیگا

کنھیا جی کی پیدائش کے فوراً بعد ان کی ماں دیوکی جی نے اپنے شوہر باسدیو سے کہا کہ اس بچہ کو فوراً لیکر گوکل چلے جاؤ، دیر نہ کرو ورنہ اگر راجہ کنش کو معلوم ہو گیا تو وہ بچہ

---

[1] کلیات نظیر ص ۲۹۰

کو قتل کر دے گا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جس اندھیرے مندر میں یہ لوگ قید تھے اس کے باہر پہرہ تھا اور دروازوں میں تالے پڑے تھے پھر بھی دیوکی جی نے کہا کہ ڈرو مت، ایشور کے بھروسے لے جاؤ۔ چنانچہ وہ بچہ کو لے کر نکل جانے کیلئے تیار ہوئے تو تالے خود بخود کھل کر گر پڑے اور پہرے دار خواب غفلت میں پڑے تھے اور باسدیو جی اپنے بچہ کو نہایت آسانی کے ساتھ گوکل لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جناب نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظم میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے آگے کہا ہے کہ یہ عجیب اتفاق تھا کہ گوکل میں یشودا کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی تھی جسکی وجہ سے اور آسانی یہ ہو گئی کہ باسدیو جی نے کنہیا جی کو اس بچی سے بدل لیا اور بچی کو اپنے گھر لے آئے۔ اب آگے کا منظر نظیر صاحب نے منظوم کیا ہے ؎

اب نند کے گھر کی بات سنو واں ایک اچنبھا یہ ٹھہرا | جو رات کو جنمی تھی لڑکی وہ بھور کو دیکھا تو لڑکا
گھڑیالیں چھوٹیں ناچ ہوا اور نوبت کا غل شور ہوا | پھر کشن کنہیا نام رکھا سب کنبے کے مل بیٹھے آ

انند اور جسودا اور گوات کرنے واں ہیرا پھیر لگے
پکوان مٹھائی میوے کے ہر ناری آگے ڈھیر لگے

سب ناری آئیں گوکل کی اور پاس پڑوسن آ بیٹھیں | کچھ ڈھول مجیرے لائی تھیں کچھ گیت بجا کے گاتی تھیں
کچھ ہر دم مکھ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں | کچھ تھال نیچری کے رکھتیں کچھ سونٹھ سنٹھورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو آئے ہیں آنند بدھاوا لینے کو

اس طویل نظم کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں۔ جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے اس نظم میں ہندو تہذیب، ہندی مصطلحات، ہندوانہ رسم و رواج سب کچھ اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

بالپن میں بانسری بجیا

کنھیاجی سے متعلق ایک دوسری نظم "بالپن میں بانسری بجیا" کے عنوان سے نظیرؔ صاحب نے کہی ہے۔ اس کے بھی چند بند ملاحظہ کریں [1]

یوں بالپن تو ہوتا ہے ہر طفل کا بھلا | پر ان کے بالپن تو کچھ اور ہی تھا
اس بھید بھلا جی کسی کو خبر ہے کیا؟ | کیا جانے اپنے کھیلنے آئے تھے کیا کلا

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیا کا بالپن

وہ بالپن میں دیکھتے جیدھر نظر اٹھا | پتھر بھی ایک بار تو بن جاتا موم سا
اس روپ کو گیانی کوئی دیکھتا جو آ | ڈنڈوت ہی وہ کرتا تھا ماتھا جھکا جھکا

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیا کا بالپن

موہن مدن گوپال ہری بنس من ہرن | بلہاری ان کے نام پر میرا یہ تن بدن
گردھاری نندلال ہری ناتھ گوردھن | لاکھوں کئے بناؤ ہزاروں کئے جتن

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنھیا کا بالپن

بانسری اور اس کی پرکشش لَے کے بارے میں بھی نظیر صاحب نے کہا ہے کہ [2]

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری | کیا کیا پریم پیت بھری اس میں دھن بھری
لَے اسمیں رادھے رادھے کی ہر دم بھری گھری | لہرائی دھن جو اسکی ادھر اور ادھر ذری

---

[1]-[2] کلیات نظیر ص ۴۴۲، ۵۰۰

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

کتنے تو اس کی دھن کے لئے رہتے بیقرار — کتنے لگائے کان ادھر رکھتے بار بار
کتنے کھڑے ہو راہ میں کر رہتے انتظار — آئے جدھر بجاتے ہوئے شیام جی مرار

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

موہن کی بانسری کے میں کیا کیا کہوں جتن — لَے اسکی من کی موہنی دھن اسکی چت ہرن
اس بانسری کا آن کے جس جا ہوا بچن — کیا جل پون نظیرؔ پکھیرو وکیا ہرن

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنھیا نے بانسری

لہو ولعب کنھیا

کنھیا جی کی تعریف و توصیف میں نظیرؔ نے مختلف عنوان سے نظمیں کہی ہیں اس سلسلہ کی دوسری نظم" لہو ولعب کنھیا" ہے جسمیں کنھیا جی کی اس لیلا کا ذکر ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ جب وہ جمنا ندی میں تیر گئے اور لڑکوں اور گوالینوں سے کہا یہ گیند جو جمنا میں پھینکے وہی لے آئے اتنا کہہ کر خود انھوں نے ہی گیند کو ندی کے ایک گہرے غار میں پھینک کر، گیند نکالنے کے لئے دریا کے اس غار میں کود گئے جہاں ایک کالا ناگ بیٹھا تھا جس نے کنھیا جی کو اپنے گرد لپیٹ لیا لیکن کنھیا جی نے اس کالے کو خود ہی ناتھ لیا اور اس کے پھن پر ہاتھ رکھے ہوئے باہر نکل آئے۔ نظر کے چند اشعار سنئے۔

اک روز خوشی سے گیند تڑی کے موہن جمنا تیر گئے واکھیلن لاگے ہنس ہنس کے یہ کہکر گوال اور بال سبھی
جو گیند تڑی جا جمنا میں پھر جاکر لاوے جو پھینکے وہ آپی انترجامی تھے کیا انکا بھید کوئی پاوے

یہ لیلا ہے اس نند للن من موہن جسمت چھیا کی
رکھ دھیان سنو ڈنڈوت کرو جے بولو کرشن کنھیا کی

جس دہ میں کوجے من موہن وا ان آن چھپا اک کالی تھا سرپاؤں سے انکے آلپٹا اس دہ کے بھیتر دیکھتے ہی
پھن مارے پھنچا زور کئے اور پہروں تک وا ان کشتی کی پھنکاریں بل بیچ کئے پر کرشن رہے واں ہنستے ہی

یہ لیلا ہے اس نند للن من موہن جسمت چھیا کی
رکھ دھیان سنو ڈنڈوت کرو جے بولو کشن کنھیا کی

مذکورہ بالا اشعار میں ہندو عقیدہ کی گرہ کشائی بھی ہو جاتی ہے اور ہندوانہ الفاظ کی تشریح بھی۔ اب ایک دوسری کتھا "کنھیا جی کی شادی"[1] کے عنوان سے پیش کی جارہی ہے جو بہت طویل ہونے کی وجہ سے مختصراً اس منظر کی نشان دہی کرتی ہے ۔
جب شادی کی غرض سے لڑکی کی تلاش میں رادھیکا کے گھر پیغام بھیجا گیا لیکن رادھیکا کی ماں نے یہ پیغام حقارت سے ٹھکرادیا تو کنھیا جی خود ہی رادھیکا کے یہاں آپہنچے اور بانسری بجائی تو اس کی دلکش آواز کو سنکر سب لوگ اس جانب دوڑ پڑے ۔ رادھیکا بھی باہر آنکلیں اور جب کنھیا جی پر نظر پڑی تو وہ خود ہی کنھیا جی کے عشق میں مبتلا ہو گئیں۔ اس واقعہ کے ضمن میں نظم کے چند بند ملاحظہ کریں ؎

جہاں میں جس وقت کرشن جی کی اوستا سدھ بدھ کی یار و آئی
سنبھالا ہوش اور ہوئے سیانے وہ بالپن کی ادا بھلائی

---

[1] کلیات نظیر صہ ۴۳

ہوا قد ان کا کچھ اس طرح سے کہ قمری جس کی فدا کہائی
نکالی طرزیں پھر اور ہی کچھ بدن کی سج دھج نئی بنائی
ہوئے خوشی نند اپنے من میں ۔ بہت ہوئی خوش جسودا مائی
جو سدھ سبھالی تو کرشن کیا کیا لگے پھر اپنی چھبیں دکھانے
جگہ جگہ پر لگے ٹھٹکنے ادا سے بنسی لگے بجانے
وہ بچھڑی گئووں کو ساتھ لیکر لگے خوشی سے بنوں میں جانے
جو دیکھا نند اور جسودا نے یہ کہ شیام اب تو ہوئے سیانے
یہ ٹھہری دونوں کے من میں آکر کریں اب انکی کہیں سگائی

شادی کا پیغام

شادی کا پیغام رادھا پر کھ بھان کی ایک خوبصورت لڑکی رادھیکا کیلئے بھیجا گیا لیکن لڑکی کی ماں کیرت نے حقارت سے انکار کرتے ہوئے کہا ؎

جو رادھکا کی وہ ماں تھی کیرت یہ سنکے باتیں وہ بولی ہنس کر
وہ ایسے کیا ہیں جواب ہمارے جس اور دولت کے ہوں برابر
ہیں جیسے وہ تو سو ایسے ہیں گے ہمارے گھر کے تو کتے چاکر
ہم اپنی لڑکی انھیں نہ دیں گے وہ ایسا گھر کیا وہ ایسا کیا بر
کرو ہمارے گھر میں تم یاں اب اس سگائی کی تب کہائی

شادی کے پیغام کو جب رادھیکا کی ماں کیرت نے ٹھکرا دیا تو کرشن جی نے وہاں خود پہنچکر جب بانسری بجائی تو منظر کچھ اور ہی ہو گیا' رادھیکا خود ہی کرشن جی پر فریفتہ ہو گئیں ۔ جیسا کہ نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں ؎

سہیلیوں سنگ رادھیکا بھی کہیں ادھر کو جو آن نکلی
سروپ دیکھا وہ کرشن جی کا ادھر سے انکی سنی جو مُرلی
جو ہیں وہاں رادھکا جی آئیں تو ایسی موہن نے موہنی کی
دکھایا اپنا سروپ ایسا کہ انکی صورت کو دیکھتے ہی
ادھر تو رادھے کے ہوش کھوئے ہر اک سہیلی کی سدھ بھلائی

دسم کتھا[1]

یہ نظم دراصل کرشن جی کے سلسلہ کی ایک طویل کتھا ہے۔ کرشن جی کی شادی رکمنی سے کیسے ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بھیکم ایک راجہ تھا جسکی ایک حسین لڑکی رکمنی تھی۔ اس کے بڑے بھائی کا نام رکم تھا۔ جب رکمنی کرشن جی کے ظاہری اور باطنی اوصاف سے واقف ہوئی تو دل وجان سے ان پر عاشق ہو گئی، لیکن اس کے بڑے بھائی رکم کو یہ تعلق اور رشتہ گوارا نہیں ہوا اس نے سسپال سے اس کا رشتہ کر دیا۔ رکمنی کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت زیادہ پریشان ہوئی اور اپنے حالِ زار سے متعلق ایک تفصیلی خط کشن جی کو لکھا کہ وہ بہت جلد آ کر اسے اپنے ساتھ لے جائیں تاکہ سسپال سے شادی نہ ہو سکے۔ کرشن جی خط پڑھ کر خود بھی بیقرار ہو گئے اور فوراً رکمنی کے پاس پہنچے۔ رکمنی کے باپ بھیکم نے ان کی پذیرائی کی، رکمنی بھی وہیں کھڑی تھی، کرشن جی نے رکمنی کا ہاتھ تھام کر اپنے رتھ میں بیٹھا لیا۔ اس عرصہ میں سسپال بھی اپنے ہمدردوں کی فوج اور سازو سامان کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ کرشن جی نے رکم اور سسپال

---

[1] کلیات نظیر ص۵۸۰

کو مار بھگایا اور رکمنی کو لیکر دوارکا پہنچے۔ آگے اس کتھا کے مختصراً چند بند ملاحظہ کریں۔

چھپتی نہیں چھپائے سے صورت جو چاہ کی ۔۔۔ سکھیاں سہیلیاں جو تھیں اور لڑکیاں سبھی
دیکھی جو رکمنی کی انھوں نے جو بے کلی ۔۔۔ جانا کہ رکمنی کا لگا ساتھ ہر کے جی
کہنے لگیں انھوں کی وہ باتیں بنا بنا

دیکھا مکند پر سے جو لوگوں نے ہر کو واں ۔۔۔ سب درشن ان کے پا کے ہوئے جی میں شادماں
آپس میں سب وہ کہتے تھے نر اور ناریاں ۔۔۔ بر رکمنی کے یہ ہوں تو ہر من کو سکھ ہو یاں
ہر دم اسی مراد کی مانگے تھے سب دعا

بھیکم جو ہر کو لینے کو آیا بہت خوشی ۔۔۔ درشن جو ہر کے پائے تو منتی بہت سی کی
اتنے میں رکمنی جو تھی ہر کے لئے کھڑی ۔۔۔ درشن جو پائے آ گیا واں اسکے جی میں جی
ہر نے پکڑ کے ہاتھ لیا رتھ میں واں بٹھا

سسپال اپنا لے کے کٹک آ گیا وہاں ۔۔۔ یاں اسکی ہر نے کاٹ بھگایا اسے نداں
آیا رکم جو بان دھنک لے کے اور سناں ۔۔۔ اسکو بھی ہر نے باندھ لیا کاٹ اسکی باں
منتی سے رکمنی تے دیا اس کا جی چھٹا

سسپال اور رکم کا ہوا جب یہ حال واں ۔۔۔ بلدیو جی نے ان کے کٹک سب بھگائے واں
لے رکمنی کو ہر ہوئے پھر دوار کا رواں ۔۔۔ جب آن پہنچے خوش ہوئے سب نر و ناریاں
دیکھا جمال ان کا تو پایا بہت بھلا

سب دوارکا میں دھوم یہ شادی کی مچ گئی ۔۔۔ باجے مجیرے طبلے رباب بھی اور ترئی
در پر براتیوں کی بہت بھیڑ آ گئی ۔۔۔ سو کھا سے دوار پر وہ بدھن وار بھی بندھی
پنڈت بلا مگن سے وہ پھیرے دیئے پھرا

بیٹھے تھے دوار کا کے یہاں خورد اور کبیر   ہوتے تھے راگ رنگ خوشی سے جوان و پیر
ساماں تھے ہزاروں ہی شادی کے دل پذیر   جو خوبیاں ہوئیں سو وہ کیا کیا کہے نظیر
اس ٹھاٹھ سے وہ بیاہ عجب کشن کا ہوا

ہر کی تعریف[1]

نظیر اکبرآبادی نے ہر کی تعریف کے عنوان سے بھی ایک طویل نظم کہی ہے جو سراپا ہندی الفاظ و مصطلحات میں ڈوبی ہوئی ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی زبان و بیان پر انھیں کتنی قدرت حاصل تھی اور ہندو معتقدات سے کتنی واقفیت اور شغف تھا۔ اس نظم کا مختصر اً پس منظر یہ ہے کہ جوناگڈھ میں ایک مہا نرسی کی صرافہ کی دوکان تھی جو خوب چلتی تھی اور وہ اس دوکان کے کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد نرسی کی سری کرشن کی طرف توجہ مبذول ہو گئی تو سب لیکھا جوکھا لین دین کام کاج چھوڑ کر ہر کے بھگتوں اور سنتوں میں شامل ہو گئے۔ دوکان وغیرہ سب بیچ دیا اور بالکل مفلس ہو گئے نرسی کی ایک بہن تھی جس کے لڑکے کی شادی ہو رہی تھی اس موقع پر لڑکی رسم و رواج کے مطابق اپنے باپ سے اس لڑکے کیلئے کچھ مانگ کی۔ ادھر نرسی کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ہر کی یاد اور بھگتی تھی۔ انھیں بہت ندامت ہوئی وہ اپنی بہن سے ملنے اور اظہارِ افسوس کرنے ایک ٹوٹی ہوئی سواری میں بیٹھ کر پہنچے جہاں شادی کی پوری تیاری ہو رہی تھی۔ اپنی اس بے بسی پر نرسی کو سخت ندامت تھی لیکن وہاں ہر کی لیلا اور کرپا دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شادی کے سارے سامان کپڑے، زیورات اور دوسرے لوازمات چھکڑوں، بھینسوں اور اونٹوں پر لدے چلے آرہے ہیں،

[1] کلیات نظیر ص ۷۶۶

جس سے نرسی کی ندامت اور پریشانی دور ہو گئی۔ ان واقعات و مناظر کو نظیر اکبرآبادی کے کلام میں دیکھئے، وہ کہتے ہیں کہ ؎

بھانت سی کشن کی جو جو کرپا ہیں کب کیسے انکی ہو گنتی
ہیں جتنی انکی کرپائیں اک یہ بھی کرپا ہے ان کی
مذکور کروں جس کرپا کا وہ بنتی ہے اس بھانت سنی
جو اک بستی ہے جونا گڈھ واں رہتے تھے مہتا نرسی
تھی نرسی کی اس بستی میں دوکان بڑی صرافی کی
بیوپار بڑا صرافی کا تھا بستا لیکھن اور بہی
دن کتنے میں پھر نرسی کا سی کشن چرن سے دھیان لگا
جب بھگتی ہر کے کہلائے سب لیکھا جوکھا بھول گیا
سب کاج بسارے کام تجے ہر نام بھجن سے من لاگا
جا بیٹھے سادھ اور سنتوں میں نت سنتے رہتے کشن کتھا
تھا جو کچھ دوکان بیچ رکھا وہ درب جمع اور پونجی کا
مدھ پیت کے ہو کر متوالے سب سادھوں کو ہر دوں دیا
ہو بیٹھے ہر کے دوارے پر سب میت کٹم سے ہاتھ اٹھا
سب چھوڑ بکھیڑے دنیا کے نت ہر سمرن کا دھیان لگا

نت من میں ہر کی آس دھرے خوش رہتے تھے واں یوں نرسی
اِک بیٹی آنکھ جنمی تھی سو دور کہیں وہ بیاہی تھی

اور بیٹی کے گھر جب شادی واں ٹھہری بالک ہونیکی

تب آئیں ایدھر ادھر سے سب ناریاں اسکے کہنے کی

مِل بیٹھیں گھر میں ڈھول بجا آنند خوشی کی دھوم مچی

سب ناچیں گائیں آپس میں ہے ریت جو شادی کی ہوتی

ہے رسم یہی گھر بیٹی کے جب بالک منہ دکھلاتا ہے

تب بالک اسکی چھوچھک کا ننھیاں سے بھی کچھ جاتا ہے

واں ناریاں جتنی بیٹھی تھیں سمدھیانے میں آ نرسی کے

جب نرسی کی واں بیٹی سے یہ بولیں ہنسکر طعنہ دے

کچھ ریت نہیں آئی اب تک اے لال تمھارے میکے سے

اور دل میں تھیں یہ جانتی سب وہ کیا ہیں اور کیا بھیجیں گے

اُن ناریوں کو تو کرنی تھی اسوقت ہنسی واں نرسی کی

بلوا کے لکھیتا جلدی سے یہ بات انھوں نے لکھوا دی

جب چٹھی نرسی پاس گئی تب بانچتے ہی گھبرائے گئے

لجیائے من میں اور کہا یہ ہو سکتا ہے کیا مجھ سے

اس وقت بڑی لاچاری ہے کچھ بن نہیں آتا کیا کیجے

پھر دھیان لگا ہر آسا پر اور من کو دھیرج اپنے دے

وہ ٹوٹی سی اک گاڑی تھی چڑھ اس پر بے وسواس چلے

سامان کچھ ان کے پاس نہ تھا رکھ شیام کی من میں آس چلے

سی کشن بھروسے جب نرسی یہ بات جو من سے کہہ بیٹھے

کیا دیکھتے ہیں واں آتے ہی سب ٹھاٹھ وہ اس جا آ پہنچے

کچھ چھکڑوں پر اسباب کسے کچھ بھینسوں پر کچھ اونٹ لدے

تھے ہنسلی کھڑوے سونے کے اور تاش کی ٹوپی اور کرتے

کچھ کپڑوں پر انبار ہوئے اور ڈھیر کناری گوٹوں کے

کچھ گہنے جھمکے چار طرف کچھ چمکی چیر جھلاجھل کے

واں جس دم ہر کی کرپا تے یوں نرسی کی تب لاج رکھی

اس نگری بھیتر گھر گھر میں تب نرسی کی تعریف ہوئی

بہتیرے آدر مان ہوئے اور نام بڑائی کی ٹھہری

جب لکھ بھیجی تھی جتنے سے ہر مایا سے وہ سانچ ہوئی

ہر کی تعریف میں مذکورہ بالا نظم اپنے پورے ہندو تہذیب و معتقدات کے ساتھ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ اسکے بعد نظیر کی دوسری نظم "درگا جی کا درشن" ہے جو خالص ہندی الفاظ پر مشتمل ہے، اس کے بھی چند بند بطور نمونہ پیش کرتے ہیں

درگا جی کا درشن[۱]

من باسی کہیے کیونکر جی ہے کاشی نگری برسن کی ہے تیر گیانی دھیانی کا ہر پنڈت اور دھن برسن کی

جو بستے ہارے دور کے ہیں جھوم ہے ان من ترسن کی اس دیوی دیونی نٹ کھٹ کے ہے چاہ چرن کے پرسن کی

ہر سند بہت من ہوتے ہیں یہ ریت رچی ہے ہر سن کی

تعریف کہوں میں کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درسن کی

اس منڈل اونچے مکٹ میں جو دیبی آپ براجت ہیں تن ابرن ایسے جھلکت میں جو دیکھ چندرما لاجت ہیں

---

[۱] کلیات نظیر صـ۲۲۴

دھن پوجا کھن ٹھن کی ایسی نت نوبت نو باجت ہیں اس مندر مورت دیبی کا جو برنن ہو سب چھاجت ہیں

پرسند بہت من ہوتے ہیں یہ ریت رچی ہے ہر سن کی
تعریف کہوں میں کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درسن کی

جو مہر ستے اس دیبی کی وہ ددرد سا سے دھاوت ہے جو دھیان لگا کر دھاوت ہے سب واکی آس پجھاوت ہے
جب کرپا واکی ہوت ہے تب واکے درشن پاوت ہے مکھ دیکھت ہے وا مورت کا من تن میں سیس نواوت ہے

پرسند بہت من ہوتے ہیں یہ ریت رچی ہے ہر سن کی
تعریف کہوں میں کیا کیا کچھ اب درگا جی کے درسن کی

اس نظم میں بھی نظیرؔ نے عام ہندوانہ الفاظ و معتقدات کو کس قدر چابک دستی سے پرو دیا ہے اور رب کے اعجاز و کرامات کا ذکر بھی نہایت عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ اس کے بعد ہی نظیرؔ نے بھیروں کی تعریف میں بھی ایک نظم کہی ہے جس میں خود نظیرؔ کی عقیدت مندی کے والہانہ جذبات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ متصوفانہ نظم بھی طویل ہے جسے ہم مختصراً تحریر کرتے ہیں۔ ملاحظہ کریں ؎[1]

دیکھا ہے جب سے میں نے تیرا جمال بھیروں رکھتا ہوں تب سے دل میں تیرا خیال بھیروں
دن رات ہے یہ میرا تجھ سے سوال بھیروں اب درد و غم سے آ کر مجھ کو سنبھال بھیروں
تیری سرن گہی ہے کر تو نہال بھیروں
اے پرتپال دیوت مدھ مست کال بھیروں

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا تن میں بھبھوت مل کر گل بیچ منڈ مالا
آنکھیں دیا سی روشن ہاتھوں میں مے کا پیالا ہوں دل سے داس تیرا سن اے مرے دیالا

---

[1] کلیات نظیر ص ۲۷۷

تیری سرن گہی ہے کرتو نہال بھیروں

اے پرتپال دیوت مدھ مست کال بھیروں

ماتھے پہ تیرے ٹیکا سیندور کا براجے مدھ پیوے ماس کھاوے جو تو کرے سو چھاجے

ترسول کاندھے اوپر ڈھورو کی گت بھی باجے سب تج کے میں نے اب تو تیری دیا کے کاجے

تیری سرن گہی ہے کرتو نہال بھیروں

اے پرتپال دیوت مدھ مست کال بھیروں

پوجا کتھا میں تیرے میں گُن بکھانتا ہوں تجھ کو ہی پوجتا ہوں تجھ کو ہی مانتا ہوں

دھول اب تیرے چرن کی ماتھے پہ سانتا ہوں تیرا ہی ہو رہا ہوں تجھ کو ہی جانتا ہوں

تیری سرن گہی ہے کرتو نہال بھیروں

اے پرتپال دیوت مدھ مست کال بھیروں

مہادیو کا بیاہ[۱]

آیئے اب نظیر اکبرآبادی کی ایک دوسری نظم "مہادیو کا بیاہ" کی طرف رُخ موڑتے ہیں جو بہت طویل ہے، جسمیں ہندو تہذیب کے خدوخال نمایاں ہیں۔ یہ نظم ہندی زبان و مصطلحات، ہندو رسم و رواج، رزم و بزم، ساز و سامان، عیش و عشرت، زیورات، رنگ برنگ لوازمات اور ہندی تشبیہات، ہندو مائیتھالوجی کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ؎

یوں کہتے ہیں اس دنیا میں اک راج پتی ہماچل تھا

وہ دھرمی عدلی نیک جتو کھ جند دلاور بھج بل تھا

---

[۱] کلیات نظیر ص۶۹۰

گڑھ کوٹ بڑے گر پربت سے اور فوج سپہ کا دنگل تھا
گج ہستی اونچے جھول زری انباری ہووے کنجل تھا
ہتھ ہاہلیں میانہ لال رتھیں چنڈول پر اطلس مخمل تھا
خوش رنگ ترنگاں تیز قدم ہر زین جھمکتا ہر پل تھا
سب ساز جڑاو گج گاہیں کوئی چنچل تھا کوئی کوتل تھا
ہر بستر چیر جھلاجھل کا دھن دولت پلّو آنچل تھا
پکھراج زمرد لعل منوں من ملتا بھی بے اٹکل تھا
محلات سنہرے رنگ بھرے درباری اور سکھ منڈل تھا
کل برتن سونے روپے کے اور ہیرا جیری کا دل تھا
باغات بڑی تیاری کے ہر ڈالی پر گل اور پھل تھا
زر زیور ٹھاٹھ اسباب بہت اور عیش خوشی کا پھل تھا
گھر جگمگ جگمگ کرتا تھا سکھ چین آنند اور منگل تھا
ہر آن طرب ہر دم چہلیں جی جان ہر اک اوقات خوشی
وہ راجہ بھی ہر وقت خوشی اور پرجا بھی دن رات خوشی
اس راجہ ہماچل کے گھر اک بالی سندر بیٹی تھی
مکھ اس کا چندر للن کا تھا نام اس کا گورا پاربتی
لب لعل یمن اور غنچہ دہن تن برگ سمن قد سرو سہی
پوشاک جھلکتی تاش زری ان گنتی پہنے من موتی
وہ کنٹھلے کنگن کندن کے وہ بازو چھلّے اور مندری

وہ جھا نجھن بجتی چاندی کی اور چوڑی گھنگرو چور اسی
ماں باپ کی پیاری ناز بھری آنکھوں آگے نسدن پھرتی
نت رہتی ہاتھوں چھانوں میں اور رمانی آس مرادوں کی
تھی رہتی گورا پاربتی ان روپ سرو پوں ابرن میں
سب طور خوشی سے پھرتی تھی نت اپنے گھر اور آنگن میں

اس کے بعد تشبیب اور گریز کے منظوم قصہ کا پس منظر یہ ہے کہ راجہ اپنی بیحد خوبصورت لڑکی کیلئے خوبصورت اور دولت مند شوہر کی تلاش کرنے کے لیئے پروہتوں کو بلا کر کہا کہ تم پاربتی کیلئے اچھی ساعت دیکھ کر نکلو اور تمام شہروں میں جاؤ اور ایک خوبصورت بَر (شوہر) تلاش کرو۔ پروہت خوش ہو کر شہر شہر ملک ملک اور گاؤں گاؤں گئے لیکن کوئی حسب خواہش مناسب ایسا بَر (شوہر) نہیں ملا جسے راجہ بھی پسند کرے بہر حال پروہت لوگ ادھر ادھر تلاش میں پھرتے پھراتے کیلاش پہنچے تو دیکھا شیوجی اکیلے بیٹھے ہیں، پروہت ان کے درشن سے بہت خوش ہوئے اور پسندیدگی کے طور پر ان کے ماتھے پر کیسر کا ٹیکہ لگا دیا۔ راجہ کو جب پروہتوں کی طرف سے اطلاع ملی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور پاربتی کی سگائی کی دھوم مچ گئی۔ راجہ نے ایک خط لکھ کر شیو شنکر جی کو بیاہ کیلئے تاریخ اور دن مقرر کر دیا۔ شیو شنکر جی خط پاتے ہی بیاہ کیلئے فوراً نہایت سادہ اور بے سرو سامانی کی حالت میں جوگی کے بھیس میں پہنچے جن کے پاس کاندھے پر ایک ترشول چکر رکھا ہوا تھا۔ کوئی ٹھاٹ باٹھ نہیں میلی کچیلی گدڑی میں پہنچے اور مرچھالا بچھا کر آسن ڈال دیا۔ نہایت تعجب اور افسوس کے ساتھ لوگ انھیں دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں نے شیوجی سے پوچھا کہ آپ نے راستے میں کوئی بارات

آتی ہوئی دیکھی ہے تب، انھوں نے ہنس کر کہا 'میں ہی تو بیاہنے کیلئے آیا ہوں' یہ سنکر سب حیران رہ گئے اور کہنے لگے پاربتی جی کی تقدیر پھوٹ گئی ہے۔ خود راجہ نے پروہت کو بلا کر پوچھا یہ کیسا ٹیکہ کرلائے پروہت بھی بہت پریشان اور شرمندہ ہوئے۔ انھیں شرمندہ دیکھ کر شیو شنکر جی نے اپنی لیلا اور کرشمے دکھائے اور خود بخود ہر قسم کے سامان بیش قیمت فوراً مہیا ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر سب لوگ دنگ رہ گئے اور خوشی خوشی پاربتی جی کا بیاہ رچایا گیا۔ نظیر اکبر آبادی اب شادی کا منظر یوں پیش کرتے ہیں۔ [۱]

جب بیٹھے شیو کی شادی میں کل تینتیس کوٹھ جو ہیں دیوتا
لشن آپ تھے آئے اور برہما اور اندر ناد من اس جا
اور سکرؔ اور برہسپت بھی اور نانوں سنیچر بھی جن کا
وہ روپ سروپ اور پوشاکیں وہ اونچی شانیں زیب فزا
اس وقت خوشی سے مندر پر شیو بیٹھے بن کر یوں دولھا
مکھ پان کی لالی کر منہدی اور آنکھوں بیچ لگا کجرا
ہر تار چمکتا چیرے کا اور تاش سنہرے کا باگا
اس تار زری کے چیرے پر جوں مہر چمکتا مکٹ دھرا
جب بیٹھے شیو یوں دولھا بن تب پریوں کا واں ناچ ہوا
اور کرنا سرنا جھانجھ بجے نقارے گونجے شور مچا
جب راجہ نے یہ حکم کیا تیاری ہو اب بھوجن کی
منگوا کے میدا لاکھوں من اور میوے مصری شکر گھی

---

[۱] کلیات نظیر ص ۲۸۰۸

حلوائی ہزاروں آبیٹھے کر گرم کڑھاؤ رکھ تھال نئی

کر کھوئے ستھرے دودھ منگا اور ڈالی چینی شکر تری

پھر ڈالا خوب گلاب اسمیں اور ڈالیں ڈلیاں مصری کی

انبار لگائے پیڑوں کے اور ڈھیر گلابی اور برفی

پھر لڈو بھی تیار کئے دے قند بہت بادام گری

براق مکدّ اور خرمے بھی خوش رنگ امرتی بیر بلی

جو حکم ہوا تھا اتنی تو سو خوبی سے بنوا ڈالی

جب راجہ نے بھی آنکھ اٹھا ہر جنس بہت ستھری دیکھی

جب رات ہوئی تب شیو شنکر خوش وقتی سے سوار ہوئے

سب آگے پیچھے دولھا کے دلشاد براتی ساتھ چلے

فانوسیں رنگین جھلملیاں اور جھاڑ بڑی گلکاری کے

ہر آن جڑاؤ چنور ڈھلیں اور سیس کے اوپر چھتر پھرے

وہ پریاں ناچیں تختوں پر پوشاکیں گہنے جھمک رہے

نقارے نوبت طبل نشاں الغوزے بجتے اور ڈفلے

کچھ رنگ عجب کچھ ڈھنگ نئے سب ہنس ہنس دھج دکھلاتے تھے

تھے دھوم مچاتے رستے میں ہر آن اچھلتے جاتے تھے

جس آن برات آئی در پر یہ خوبی ٹھہری زیب بھری

وہ پریاں ناچیں تختوں پر جھنکاریں مار مجیروں کی

کل زیب براتی چار طرف اور بیچ سواری دولھا کی

سب چھجے چھجے کوٹھوں پر واں دیکھیں زینت اور خوبی
وہ آئی تھی جو ساتھ لدی اور آتشبازی تھی چھٹتی
مہتاب انار اور پھلجھڑیاں ہت پھول ہوائی خوب کڑی
سب شاد ہوئے خوش وقت ہوئے یہ دیکھ تماشے خوبی کے
کر وصف بہت بلہار ہوئے اس دولھا کی محبوبی کے
جب ساعت آئی پھیروں کی تب ٹھہری اس جا یہ خوبی
گھر بیچ بلایا دولھا کو اور پھیروں کی تیاری کی
کچھ بیٹھے لوگ ادھر اودھر سب اپنے من کے بیچ خوشی
جو فرش مقرر ہے اس پر آ بیٹھے دولھا دولھن بھی
جب دولھا دولھن مل بیٹھے تب ریت ہوئی گٹھ جوڑے کی
وہ پنڈت آئے ہوم کیا سب لاکر اسکی چیز رکھی
جب شیو نے واں یہ حکم کیا تیاری ہو اب چلنے کی
اور آپ مندر کے بیچ گئے تو ہوئے بدا واں دولھن کی
یہ بات بدا کی سنتے ہی واں گورا کی ماں یوں بولی
سب طور تم اسکے مالک ہو یہ چیری میں نے تم کو دی

الغرض یہ طویل نظم قطع و برید کے بعد یہیں ختم ہو رہی ہے جسکی واقعہ نگاری اور منظر کشی قابل دید ہے۔ خاص طور پر ٹھیٹھ ہندوانہ زبان، رسم و رواج، ناچ رنگ طور طریقے سے ہندو تہذیب کا ایک پیکر سامنے آجاتا ہے۔

ہندو معتقدات و تہذیب و روایات کے سلسلہ کی نظیر اکبر آبادی کی

ایک دوسری نظم "کنھیا جی کی راس" کے عنوان سے پیش کی جارہی ہے، جس میں کنھیا جی اور گوپیوں کے ناچ رنگ کا ایک خوبصورت سماں باندھا گیا ہے۔ اس نظم میں بھی ہندوئیت پورے شباب پر جلوہ گر ہے۔ چند بند ملاحظہ کریں۔

کنھیا جی کی راس [۱]

آئے ہیں دھوم سے جو تماشے کو گلبدن گویا کہ کھل رہے ہیں گلوں کے چمن چمن
کرتے ہیں نرت کنج بہاری بھید برن اور گھنگھروؤں کی سُن کے صدائیں چھنن چھنن
ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

پہونچے ہے آسماں تئیں مردنگ کی گمک آواز گھنگروؤں کی قیامت جھنک جھنک
کرتی ہے مست دل کو مکٹ کی ہر اک جھلک ایسا سماں بندھا ہے کہ ہر دم للک للک
ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

حلقہ بنا کے کشن جو ناچیں ہیں ہاتھ جوڑ پھرتے ہیں اس مزے سے کہ لیتے ہیں دل مروڑ
آ گر کسی کو بکڑے ہیں دیں ہیں کسی کو چھوڑ یہ دیکھ دیکھ کسی کا ہے آپس میں جوڑ جوڑ
ہر آن گوپیوں کا یہی سکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

ناچیں ہیں اس بہار سے بن ٹھن کے نند لال سر پر مکٹ براجے ہے پوشاک تن میں لال
ہنستے ہیں چھیڑتے ہیں ہر اک کو دکھا جمال سکھیوں کے ساتھ دیکھ کے یہ کانھ جی کا حال

---

[۱] کلیات نظیر ص ۳۴۷

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

ہے روپ کشن جی کا جو دیکھو عجب انوپ — اور ان کے ساتھ چمکے ہے سب گوپیوں کا روپ
مہتابیاں چھٹیں ہیں گویا کھل رہی ہے دھوپ — اس روشنی میں دیکھ کے وہ روپ اور سروپ

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنھیا کی راس ہے

بلدیو جی کا میلا

ہندو معتقدات کے سلسلہ کی ایک اور نظم "بلدیو جی کا میلا" نظیر اکبرآبادی نے کہی ہے جو بہت طویل ہے۔ بلدیو جی، کرشن جی کے بڑے بھائی تھے انھیں کے نام پر یہ میلا لگتا ہے۔ میلے ٹھیلے میں جو آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ اور طرح طرح کے لوگ، طرح طرح کے سامانوں کی دوکانیں اور انواع و اقسام کی کھانے پینے کی چیزیں فروخت ہوا کرتی ہیں۔ یہاں نوجوان جوڑوں کے غول بھی نظر آتے ہیں۔ یہی ساری چیزیں نظیر نے اپنی ترجیع بند میں دلکش انداز میں پیش کی ہیں۔ اس طویل نظم سے کہیں کہیں سے کچھ کچھ اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے — ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے چنبیلی، بیلا ہے — بھیڑ انبوہ ہے اکیلا ہے
شہری قصباتی اور گنویلا ہے — زر اشرفی ہے پیسا دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے — بھیڑ ہے خلقتوں کا ریلا ہے

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہے کہیں رام اور کہیں لچھمن — کہیں کچھ مچھ ہے اور کہیں راون
کہیں بارا کہیں مدن موہن — کہیں بلدیو اور کہیں سیکشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے جتن — کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن
کہیں نکلا ہے سیر کو بن بن — کہیں کہتا پھرے ہے یوں بن بن

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

ہر طرف گلبدن رنگیلے ہیں — نک پلک غنچہ لب سجیلے ہیں
بات کے ترچھے اور کٹیلے ہیں — دل کے لینے کو سب ہٹیلے ہیں
خشک تر نرم سوکھے گیلے ہیں — ٹیڑھے بلدار اور نکیلے ہیں
جوڑے بھی سرخ سبز پیلے ہیں — پیار الفت بہانے حیلے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

نازنیں ہیں وہ سانوری گوری — جن کی نازک ہر اک پری پوری
کر کے چتون نگاہ کی ڈوری — دل کو چھینے ہیں سب برا زوری
دھوم ناز و ادا جھکا جھوری — برج میں جیسے مچ رہی ہوری
گھونگھٹوں میں ہیں کر رہی چوری — چوری کیسی کہ صاف سر زوری

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے

زور بلدیو جی کا میلا ہے

ناچ اور راگ کے کھڑاکے ہیں گھنگرو اور تال کے جھناکے ہیں
نقلیں قصّے کہانی ساکے ہیں کھنڈ دہرے کبت کتھا کے ہیں
کہیں آغوش کے لپاکے ہیں کہیں بوسوں کے سو جھپاکے ہیں
تھرتھری دانت پر کڑاکے ہیں تس پہ جاڑے کے سو جھڑاکے ہیں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

صحن مندر کا سب سے ہے اعلا اس کا گنبد ہے عالم بالا
ہو رہا جھانکیوں کا اجیالا پردے جیسے ہیں چاند پر ہالا
ہے کوئی درشنوں کا متوالا کوئی جپتا ہے دھیان میں مالا
کوئی ڈنڈوتیں کر رہا لالا کوئی جے جے کرے ہے دھن والا

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

لاکھوں بیٹھے بساطی اور منہار اپنا سب گرم کر رہے بازار
چوڑی بنگڑی کی اک طرف جھنکار نوگرھی پوتھ انگوٹھی چھلے ہار
ٹوٹے پڑتے گنواری اور گنوار جس گنواری کو چلیے دھکا مار
بگڑ کے دے گالی یوں کہے ہے پکار کیسوا ٹھلا چلے ہے داڑھی جار

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

سیکڑوں رنگ رنگ کی جھڑیاں　　پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں　　کہیں کھلتی ہیں دل کی گلجھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں　　کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لٹ رہیں جھڑیاں　　دال موٹھیں منگوچھی اور بڑیاں

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

کیا مچی ہے بہار جے بلدیو　　عیش کے کاروبار جے بلدیو
دھوم لیل و نہار جے بلدیو　　ہر کہیں آشکار جے بلدیو
ہر زباں پر ہزار جے بلدیو　　دم بدم یادگار جے بلدیو
کہہ نظیر اب پکار "جے بلدیو"　　سب کہو ایک بار جے بلدیو

رنگ ہے روپ ہے جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

باب دوم

ہندو معتقدات، تہذیب و تمدن، رسم و رواج کے عنوان سے نظیر اکبر آبادی نے بہت کچھ لکھا ہے جسمیں سے بیشتر موضوعات پر ہم نے گذشتہ باب میں بطور نمونہ موصوف کی نظمیں پیش کردی ہیں۔ اب انھیں موضوعات اور عنوانات پر اردو کے مشہور ہندو شاعر جناب پنڈت برج نرائن چکبست کا کلام پیش کرتے ہیں، جنھوں نے ہندو تہذیب کے معتقدات اور تہذیبی ورثہ کو اپنی اردو زبان کی شاعری میں منتقل کیا ہے۔ ان کی نظم "کرشن کنھیا" کے کچھ بند ملاحظہ کریں ؎

کرشن کنھیّا

آج کی رات کا دنیا کے لئے کیا ہے پیام — حسنِ قدرت کا سرِ شام سے ہے جلوۂ عام
نور برساتے ہیں تاروں کے چھلکتے ہوئے جام — بن گیا سازِ طرب مستیٔ عالم کا نظام
فرشِ راحت پہ اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے

بے حجابی کی جو دوسانِ چمن میں ہے صدا — گل کا نکہت سے اشارہ ہے کہ پردہ کیسا؟
دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موروں کی ادا — مینہہ برسنے کو ہے کہتی ہے یہ پورب کی ہوا

پیشوائی کے لیے خلق خدا اٹھی ہے
آج جمنا کے کنارے سے گھٹا اٹھی ہے

چھا گیا ابر برسنے کو ہیں جیسے جھالے	آپ ہی آپ ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
آنکھ کہتی ہے یہ بادل نہیں کالے کالے	بال کھولے ہوئے ہیں سانوری صورت والے

کشتیٔ فکر بہی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل میرا کھینچ رہا ہے مجھے جمنا کی طرف

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی	ڈوگرا مینہہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار حسیں چھوکریاں گوکل کی	چلی آتی ہیں صراحی لیے گنگا جل کی

دل لڑکپن کی امیدوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

یہ خوشی ہے کہ منانا ہے کنھیا کا جنم	دل میں ارمان ہزاروں ہیں مگر وقت ہے کم
نہیں سینے میں سماتا ہے یہ دل کا عالم	آنکھ پڑتی ہے کہیں اور کہیں پڑتا ہے قدم

ایک کو ایک کی صورت جو نظر آتی ہے
مسکرا دیتی ہے جب برق چمک جاتی ہے

آج سوئی ہوئی دنیا کی ہے قسمت بیدار	سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار
یہی بجلی تھی یہی ابر یہی جوشِ بہار	جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شبِ تار

قید خانہ کی سیاہی میں وہ تارا چمکا
جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

تھا جو دنیا کو رہِ راست پہ لانا منظور	جلوۂ حق نے لیا قالبِ خاکی میں ظہور

جوشِ رحمت سے غنی فیض و کرم سے معمور ظلمت جہل مٹانے کو بڑھا چشمۂ نور

پردۂ غیب سے متھرا کے چمن تک پہنچا

بڑھ کے متھرا سے کروکشیتر کے رن تک پہنچا

اب ارجن ہے نہ وہ گیان کا دریا باقی نہ وہ آنکھیں ہیں نہ وہ نور کا دریا باقی

دل لبھانے کو ہے دنیا کا تماشہ باقی درد باقی ہے نہ ہے درد کا شیدا باقی

بانسری لیکے نیا راگ سنا دے کوئی

سو رہا ہے دل مایوس جگا دے کوئی

چکبست کی ایک دوسری نظم "رامائن کا ایک سین" ہے جو رامائن کا منظوم ترجمہ ہے اور ہند و تہذیب و کردار کا گرانمایہ سرمایہ بھی۔ اس حصۂ نظم میں چکبست نے دکھلایا ہے کہ جب رام چندر جی کو باپ کی طرف سے چودہ سال بن باس کا حکم ملا تو فرماں بردار اور باشعور بیٹے نے کسی اعتراض کے بغیر اس حکم کے آگے سر جھکا دیا۔ گھر چھوڑنے سے پہلے رام چندر جی خدا کا نام لیکر اپنے باپ سے پہلے رخصت ہوئے پھر اپنی ماں سے رخصت کی اجازت لینے سے پہلے آنسوؤں کو پونچھ کر دل کو سنبھالتے ہوئے ماں کے پاس گئے تو شکستہ دل ماں اپنے بیٹے سے کس طرح مخاطب ہوتی ہے، اس رقت انگیز منظر کو چکبست کے سحر انگیز قلم نے خوبصورت اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے آپ بھی دیکھیں ؎

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام

منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام • دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہو گا اور بھی
دیکھا تمھیں اداس تو غم ہو گا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا افسردہ نونہال خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں میں جانتی ہوں کس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دُلارے کو بھیج دوں

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ منجدھار میں جو یوں ہوئی کشتی مری تباہ
آتی نہیں نظر کوئی امن و اماں کی راہ اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر مری خالقِ عالم بجل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہے پروردگار کی

جناب چکبستؔ نے ماں کا جو جواب لکھا ہے، وہ منظر کشی بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ؎

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر
ہنس کر دو فورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر
جس طرح چاندنی کا ہو شمسان میں گذر
پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستاں
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیاں
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحاں
بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گماں
اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ ماں کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

ان آنسوؤں کی قدر تمھیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمھیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں
جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تجھکو تو دکھ بھی سہوں گی میں

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں

ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں　　ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں

ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دشرتھ کے راج میں

نظیر اکبرآبادی کی طرح پنڈت برج نرائن چکبست بھی خالص ہندوستانی مزاج شاعر تھے۔ انھیں بھی اپنے ملک اور اپنے وطن کی ہر شئے سے پیار تھا۔ انھوں نے حب الوطنی سے سرشار گیت بھی گائے ہیں، اکابرین پر نظمیں بھی لکھی ہیں نیز یہاں کے طبعی اور جغرافیائی حالات کو بھی منظوم کیا ہے۔ ان کی نظم "پھول مالا" سے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

پھول مالا

رنگ و روغن تمھیں یورپ کا مبارک لیکن　　قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
دل تمھارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لئے　　اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز
پوجنے کیلئے مندر ہے جو آزادی کا　　اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز
نقد اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار گئے　　تم ہو دمینتی پر دولت نہ مٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ　　تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ جگانا ہرگز

اسی طرح نظم "خاک ہند" کا صرف ایک ہی بند دیکھیں جس کا ایک ایک لفظ وطن کی محبت کا امین اور رازدار ہے، ؎

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقہ کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سوبیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں

ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

ہندو معتقدات سے متعلق موضوعات و عنوان پر اور تہذیب و تمدن پر ایک دوسرے ہندو شاعر منشی جگت موہن لال رواں نے بھی کافی نظمیں کہی ہیں اردو شاعری کے مختلف اصناف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے واقعات نگاری و منظر کشی کو ایک حسین پیرایۂ بیان عطا کیا ہے اسکا اندازہ آپ کو ان کی نظم "چترکوٹ" سے بخوبی ہو جائے گا جو ہندوانہ موضوع اور اعتقاد پر مبنی ہے۔ جسکا مختصراً پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ جب راجہ دسرتھ نے رانی کیکئی کے اصرار پر شری رام جی کو ۱۴ سال بن باس کا حکم دیا اور بھرت جی کو راج پاٹ سنبھالنے کو کہا۔ لکشمن جی اسوقت موجود نہیں تھے انھیں بلانے کا حکم صادر فرمایا تب رام چندر نے اپنے دوسرے بھائی شری لکشمن جی کو ساتھ لے کر بن باس کیلئے روانہ ہوئے اور جب باپ کا حکم بھرت جی کو گدی سنبھالنے کا اور رام چندر جی کو بن باس جانے کی خبر لگی تو بھرت جی نے راج پاٹ لینے سے انکار کر دیا اور رام چندر کو بن باس سے واپس لانے اور انھیں گدی سبھالنے کی سفارش کرنے خود ہی چترکوٹ روانہ ہو گئے اسوقت کا ایک سین جناب موہن لال رواں نے یوں نظم کیا ہے۔

"چترکوٹ"

آیا نظر جو دور سے اڑتا ہوا غبار	لچھمن کے دل کو ہونے لگا سخت انتشار
کی عرض یوں حضور شہ آسماں وقار	کچھ ہو رہے ہیں خطرہ کے آثار آشکار

تسکیں حصول تخت سے شاید ہوئی نہیں

یہ فوج ہے بھرت کی میرے دل کو ہے یقین

گرد و غبار دیکھ رہے ہیں حضور کچھ
نزدیک آ لگی، نہیں اب فوج دور کچھ
ڈر ہے مجھے کہ آج خطر ہے ضرور کچھ
نیت میں آ گیا ہے بھرت کے فتور کچھ
اس کے سوائے جنگ کے انجام کچھ نہیں
اس قافلہ کا ورنہ یہاں کام کچھ نہیں

حیرت کی جا ہے اور ہے افسوس کا مقام
بھائی کو قتل کا ہے ہمارے خیال خام
لیکن بری جگہ ہے یہ دنیا ہے جسکا نام
دل میں بھرت کے ورنہ یہ سودائے انتقام
بھائی بھرت سا اور حسد کا شکار ہے
سب مال لے کے جان برادر پہ وار ہے

لچھمن کے منھ سے سن کے یہ الفاظ زشت و کیں
کانوں کو اپنے رام کو ہوتا نہ تھا یقیں
کچھ فکر مند ہو کے باندازِ دل نشیں
بولے غلط خیال ہے ایسے بھرت نہیں
اہل وفا میں مایۂ صد ناز ہیں بھرت
دنیا کے بھائیوں میں سرافراز ہیں بھرت

آئینہ بے غبار سے خالی بھرت کا دل
ہے اک نگاہ پاک خیالی بھرت کا دل
ہے ایک ظرف ہمت عالی بھرت کا دل
بے شک ہے معالی بھرت کا دل
جام جہاں نما ہے بھرت کا دل غیور
یہ بدگمانیاں ہیں تمہاری خرد سے دور

رام اور لکشمن میں تھی یہ گفتگو یہاں
تصویر اضطراب و الم تھے بھرت وہاں
بولے بششٹ سے کہ اے نازش جہاں
یمنِ قدم رام کہاں اور بن کہاں
مل جائے خاک پا بھی پئے قشقۂ جبیں
مجھکو یقین اپنے مقدر سے یہ نہیں

سیتا کو اس وفا پہ رفاقت پہ ناز ہو　　　لچھمن کو اپنے حسن اطاعت پہ ناز ہو
خدمت پر اپنی اپنی سعادت پہ ناز ہو　　　جائے جو چترکوٹ تو قسمت پہ ناز ہو

وحشی طیور بن کے سعادت نصیب ہیں
اک ہم ہیں بدنصیب جو فرقت نصیب ہیں

یہ بات کہتے کہتے بھرت ہو گئے رواں　　　اس سمت کو جدھر نظر آیا تھا کچھ دھواں
اس اضطراب سے جو نہیں قابلِ بیاں　　　دل سرمشارِ طبع حزیں چشم خوں چکاں

سمجھے کہ بس فرودگہہ رام ہے یہی
ختم مصائب غم و آلام ہے یہی

دیکھا تو ہے بھبھوت بدن پر لگی ہوئی　　　سو بار جس پہ صدقے ہوں ملبوسِ قیصری
رونق فزا ہیں داہنے پر لکشمن جری　　　اور بائیں پر ہیں ہمدم و ہمراز جانکی

کرتا تھا کسب نور رُخ جوارِ رواج پاک سے
چمکا تھا اور رنگ بدن رنگ خاک سے

رام اٹھ کھڑے ہوئے جو بھرت پہ پڑی نظر　　　لپٹا لیا گلے سے برادر کو دوڑ کر
منظر وہ تھا فرشتے بھی حیراں تھے چرخ پر　　　نقش الم ادھر یہ وہ تصویر غم ادھر

کلفت جو تھی دلوں میں وہ اشکوں سے دھو گئی
اتنے بھر آئے دل کہ زباں بند ہو گئی

نظم کے باقی حصّہ کو قلم انداز کرتے ہیں البتہ اس سلسلہ کی ایک دوسری نظم "رحلت بال"
کے عنوان سے رواں صاحب نے کہی ہے جسکا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ بال سیگریو
کا بڑا بھائی تھا جس نے سیگریو کو نکال دیا تھا جو بغرض انتقام رام چندر جی

سے مل گیا تھا تب سیگریو نے رام جی کو غلط مشورہ دیکر بال کو مروا ڈالا تھا۔ بال کا
ایک ہی لڑکا انگد تھا۔ ایسی حالت میں انگد کی بیوی تارا کے دل پر کیا کچھ گذری اس
رقت انگیز منظر کو رواں کی زباں سے سنیے کہتے ہیں ؎

نظم "رحلت بال"

آلودہ خاک و خوں میں پڑا تھا زمیں پہ بال دکھن کی سمت پاؤں تھے سر جانب شمال
بیٹھا ہوا سکوت میں تصویر کی مثال تھا اشک ریز بال کا فرزند خستہ حال
سیگریو چپ تھا بال کے قاتل خموش تھے
چہرے کے رنگ سب کے اڑے سب برادر خموش تھے

نظریں اٹھیں ہر ایک کی اک سمت دفعتاً آتی ہوئی دکھائی دی اک شعلہ پیرہن
غم کی شبیہ نقش الم صورت محن پژمردہ پھول پر رنگ خزاں دیدۂ چمن
شدت یہ رنج کی تھی کہ بیکار تھے حواس
گیسو الجھ کے لٹکے تھے شانوں کے آس پاس

آکر قریب بال کھڑی ہو گئی وہ حور بس اتنے فاصلے سے کہ نزدیک اور نہ دور
حالت یہ کرب کی تھی کہ دم کرتا تھا قصور کچھ کہہ سکی نہ منھ سے مگر یہ ہوا ضرور
بسمل نے چشم یاس سے ایسی نگاہ کی
دشمن جو دیکھتے تھے انھوں نے بھی آہ کی

طغیانی خیال ہوئی رفتہ رفتہ کم مشکل ہوا سکوت سے اظہار رنج و غم
ایسی نظر سے جسمیں تھی حیرت و الم دیکھا بہ سمت رام پئے شکوۂ ستم
پھر ایک بار آکے فغاں لب پہ رک گئی
جس سے گلہ تھا اس سے نظر ملکے جھک گئی

جب شکوہ خموش ہوا رام سے تمام
تارا بلک کے یوں ہوئی شوہر سے ہم کلام
اب جی کے کیا کروں گی رہا کیا جہاں میں کام
دنیا کے عیش وجاہ کو بس آج سے سلام

دل کو سرور قلب کو راحت نصیب تھی
قدموں میں آپ کے مجھے جنت نصیب تھی

یہ کہکے اس نے جانب سیگریو کی نگاہ
دل میں کمال درد لب جانفزا پہ آہ ہو
بولی کہ کیا یہی تھی محبت کی رسم و راہ
بھائی کی ناؤ ہاتھ سے بھائی کے ہو تباہ

سیگریو! کیا یہ قوت بازو کا فرض تھا
وہ کام کر دکھایا جو دشمن نہ کر سکا

مانا کہ دوستی کا نہیں مستحق تھا بال
انگد کی کمسنی کا تو لازم تھا کچھ خیال
جب انگلیاں اٹھیں گی تو کیا ہوگا انفعال
یہ وہ ہیں جن کے ہاتھ ہیں بھائی کے خوں سے لال

پمپا پوری میں راج کو کس منھ سے جاؤ گے
اہل وطن کو کون سی صورت دکھاؤ گے

رام چندر جی کے بن باس ہی سے متعلق ایک اور "شکتی بان" کے عنوان سے لکھ کر رواں نے اس واقعہ کو زندگی بخشی ہے جب لنکا کا راون سیتا جی کو اٹھانے گیا اور رام چندر جی نے سیتا جی کو حاصل کرنے کے لئے لنکا پر حملہ کر دیا اس حملہ میں لکشمن جی بھی بھائی کے شانہ بہ شانہ تھے جنھیں میگھ ناتھ نے شکتی بان سے اتنا شدید زخمی کر دیا تھا کہ ان کے جانبر ہونے کی امید باقی نہیں تھی، اسوقت رام چندر جی اپنے برادر عزیز لچھمن جی کا سر اپنے زانوں پہ رکھ کر انتہائی غم والم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ عالم یاس میں وہ کیا سوچ رہے تھے

اور لچھمن جی سے مخاطب ہو کر کیا کہہ رہے تھے اس کی عکاسی رواں نے اپنی نظم میں بڑے موثر انداز میں کی ہے جو ہندو معتقدات کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ چند بند پیشِ خدمت ہیں

(جگت موہن لال رواں)

"شکتی بان"

میدان جنگ لنکا آفت کا سامنا ہے
کل فوج میں وفور رنج و غم دبکا ہے
زانو پہ رام جی کے لچھمن نے سر رکھا ہے
دشمن کو بھی ہلا دے یہ حال رام کا ہے

بیٹھے ہوئے ہیں بے کل اور ہاتھ مل رہے ہیں
نظریں جھکی ہوئی ہیں آنسو نکل رہے ہیں

لشکر پہ ہے تباہی وحشت برس رہی ہے
ہر سمت ہے اداسی شامت برس رہی ہے
یہن وغا میں گویا وحشت برس رہی ہے
چہرے سے رام جی کے حسرت برس رہی ہے

حد سے فزوں ہوا جب اندیشۂ جدائی
دل سے نکل کر اس دم فریادِ لب تک آئی

لچھمن خلاف عادت خاموش کیوں ہوئے تم
لب پر نہیں تمہارے اگلا سا وہ تبسم
کیوں روٹھتے ہو بھائی مجھ پر کرو ترحم
مختل ہے عقل میری میرے حواس ہیں گم

تعمیل حکم میں کیوں تاخیر کر رہے ہو
تعظیم چاہیئے تھی تحقیر کر رہے ہو

بستی سے ساتھ آئے جسطرح سوئے صحرا
ساتھی بنوں گا یوں ہی ہستی سے میں عدم کا
جنگ و جدال ناحق بے سود فکر دنیا
دشمن کو ہو مبارک میں فتح کیا کروں کا

بھائی اگر نہیں ہے دشوار زندگی ہے
بے لطف زندگی ہے بے کار زندگی ہے۔

ہرگز نہ میں اکیلا سوئے اودھ پھروں گا　　اہل وطن کے طعنے ہرگز نہ میں سنوں گا
یا اپنی زندگی میں جنگل میں کاٹ دوں گا　　یا دشمنوں سے لڑکر میں خود بھی مرمٹوں گا
بدنامیاں اٹھائے دنیا میں کون رہ کر
یہ فیصلہ ہے دل کا ذلت سے موت بہتر

اے الفت مجسم اے نازش عزیزاں　　اے پیکر سعادت تصویر حسن امکاں
تسکین قلب مضطر رابطہ دل پریشاں　　آنکھیں اٹھا کے دیکھو ہے کون تم پہ قرباں
آب حیات بخشو کچھ تو کہو زباں سے
کس واسطے خفا ہو رام خجستہ جاں سے

ماں باپ سے چھٹے تم منھ بھائیوں سے موڑا　　جنگل کی راہ پکڑی اپنے وطن کو چھوڑا
خاطر سے تم نے جسکی اپنوں سے رشتہ توڑا　　دل کررہے ہو لچھمن کیوں آج اسکا تھوڑا
مجھکو بھی ساتھ لے لو خواہش سفر ہے
تنہا یہاں نہ چھوڑو یہ دشمنوں کا گھر ہے

رواں کی اس نظم کو ہم یہیں چھوڑ کر اب آگے دوسری نظم کیطرف رخ کرتے ہیں انھوں نے ہندو پیشوا تلسی داس پر بھی اپنے عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں جو ہندو دھرم کے اہم متون سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے پران۔ ویدا ور گیتا جی متبرک کتاب کے مسائل کو اپنی کتاب رامائن میں سمویا ہے جسے ہندو دھرم میں ایک مقدس کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔

رواں نے اس نظم میں بتایا ہے کہ جب ہندوستان کے لوگ بد اعمالیوں میں مبتلا تھے اور مذہب کا وقار کھو چکے تھے اس وقت ان کی رہبری کیلئے

قدرت نے تلسی جی کو پیدا کیا جنھوں نے اہلِ ہند کو قعرِ مذلت سے نکال کر انسانی حقوق کی نگہداری پر مامور کیا۔ اس نظم کے بھی چند بند پیش کیے جاتے ہیں جس سے ہندو معتقدات کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

نظم "تلسی داس"، "درج رواں ص ۱۲۹" (جگت موہن لال رواں)

یہ عقیدہ ہندوؤں کا ہے نہایت ہی قدیم — جب کبھی مذہب کی حالت ہوتی ہے زار و سقیم
قادرِ مطلق جو ہے دانائے اسرار و کریم — بھیجتا ہے رہنمائی کیلئے اپنا ندیم
رہبرانِ راہِ حق جب رہبری فرماتے ہیں
بھولے بھٹکے سب مسافر راہ پر آجاتے ہیں

اک زمانہ تھا کہ غارت ہو رہے تھے اہلِ ہند — اپنا مذہب اپنے ہاتھوں کھو رہے تھے اہلِ ہند
اک عجب خوابِ گراں میں سو رہے تھے اہلِ ہند — اپنے ہی اعمال کو خود رو رہے تھے اہلِ ہند
غرق ہونے کو تھا جب بیڑا ہماری قوم کا
گوشۂ عزلت میں تلسی ناخدا پیدا ہوا

تھے پران و وید و گیتا کے مسائل جسقدر — سلک رامائن میں رکھا تو نے سب کو گوندھ کر
جو خزانے تھے پرانے ان سے ہم تھے بے خبر — آنکھیں تھیں لیکن نہ عظمت اپنی آتی تھی نظر
ہو سکے اے ملک کے محسن تری تعریف کیا
تو نے اک کوزے کے اندر بند دریا کر دیا

مرحبا اے آئینہ بردارِ فطرت مرحبا — مرحبا اے کاشفِ رمزِ حقیقت مرحبا
مرحبا اے ہم نشینِ بزمِ حکمت مرحبا — مرحبا اے دانش آموزِ طریقت مرحبا
وار رو کا ہے تری اس نظم نے تلوار کا
تیرے سر سہرا رہا ہے دھرم کے اپکار کا

دل دہل جاتا ہے ہم جسوقت کرتے ہیں خیال — تیری رامائن نہ ہوتی گر تو ہوتا کیسا حال
چند دن وہ اور چلتا گر زمانہ اپنی چال — ہمکو کر دیتی ضعیف الاعتقادی پائمال

رائے یہ میری نہیں فتویٰ ہے ساری قوم کا
تیری رامائن نہیں نغمہ ہے ساری قوم کا

جگت موہن لال رواں نے "پیام رکمنی" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے جسمیں ہندو معتقدات واقعات و کردار کو ایک عمدہ سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے انھیں واقعات و کردار اور تہذیب و روایات کو جناب نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنی نظم رسم کنھائن میں بیان کیا ہے جسے آپ گذشتہ باب میں دیکھ سکتے ہیں ان دونوں نظموں میں جو فرق ظاہر ہوتا ہے وہ زبان و بیان کا فرق کہا جا سکتا ہے۔ نظیر نے اپنی نظم میں ہندی یا ہندوانے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے جب کہ رواں صاحب نے رواں دواں اردو زبان میں رکمنی دیوی کے پیغام محبت کو کنھیا جی تک پہونچایا ہے۔ اس نظم کے چند بند آپ ہی ملاحظہ کریں۔

پیامِ رکمنی، روحِ رواں صفحہ ۱۰۷ از جگت موہن لال رواں

سواد ہند میں اک شہر کندن پور نامی تھا — اور اسمیں حکمراں تھا اک معزز بھیشمک راجہ
عفیفہ رکمنی دختر تھی اسکی حسن میں یکتا — رکم تھا بھیشمک کے سارے لڑکوں میں بڑا لڑکا

رکم اور بھیشمک کو رات دن یہ فکر رہتی تھی
کسی ہمسر سے رکمنی کی جلد ہو شادی

رکم نے گھر میں رفتہ رفتہ رکمنی کا عقد ٹھہرایا — معزز پنڈتوں اور عالموں کو پہلے بلوایا
مبارک ساعتوں میں طالع ہمشیر دکھلایا — موافق عقد کی تجویز کو جب ہر طرح پایا

مقرر کر دیا اک یوم شادی کا بھی خوش ہو کے
ادا ہونے لگیں شادی کی رسمیں دونوں جا ہے

مگر تھی رکمنی نادیدہ عاشق شیام سندر کی — نہ تھی ماں باپ کو اصلا مگر اسکی خبر کچھ بھی
وفور شرم سے کہتی نہ تھی کچھ منہ سے بیچاری — مگر ہاں دل ہی دل میں رات دن گھٹ گھٹ کے رہتی تھی

بس اسکی چادر شرم و حیا غم پوش تھی گویا
بھری محفل میں رکمن شعلہ خاموش تھی گویا

یہاں تک بیاہ سے سپال کندن پور میں پہنچا — تلک بھی ہو گیا اور یوم شادی بھی قریب آیا
بس اب تو رکمنی کا دل نہایت درجہ گھبرایا — برہمن اک معزز نیک اور سنجیدہ بلوایا

شریک درد کرکے رازداری کی قسم دیکر
کہا میری طرف سے شیام سندر کے قدم لیکر

برادر کی جفاؤں کی مصیبت ان سے کہدینا — یہ سب ناگفتنی طول حیرت ان سے کہدینا
عزیزوں کی مسرت میری کلفت ان سے کہدینا — یہاں کی سب یہ طوفاں خیز حالت ان سے کہدینا

یہ کہدینا کہ دامان تحمل چاک ہوتا ہے
کوئی دم میں بس اب رکمن کا قصہ پاک ہوتا ہے

جو پوچھیں نام میرا شیام کی بدنام بتلانا — جو پوچھیں کام تفریح دل ناکام بتلانا
جو پوچھیں وجہ کلفت عشق کا انجام بتلانا — جو پوچھیں حال سوز ہجر سے سرسام بتلانا

وطن پوچھیں تو کہنا یوں تو اک مشکل میں رہتی ہوں
مگر اب عاشقی کی آخری منزل میں رہتی ہوں

سنی جب رکمنی کی داستانِ دردِ بیماری
تو اک حیرت کا عالم شیام سندر پر ہوا طاری

اسی دم ہو گئے رخصت شکیب و صبر و خودداری
ہوئی ان کے عوض رنج و الم کی گرم بازاری

اثر انداز جذبِ عشقِ رکمن ہو گیا آخر
جو ناممکن نظر آتا تھا ممکن ہو گیا آخر

جو لفظ کھولا تو ضبطِ عشق کی روداد پیدا تھی
دہانِ زخم تھا ہر دائرہ فریاد پیدا تھی

ہر اک نقطہ سے شانِ کوشش برباد پیدا تھی
شکستِ آرزوئے خاطرِ ناشاد پیدا تھی

اثر کس طرح آخر شیام سندر پر نہ ہو جاتا
کہ یہ خونِ جگر سے رکمنی نے خط میں لکھا تھا

منشی جگت موہن رواں کی ایک دوسری نظم " دو آئینے " کا ذکر بھی ضروری اسلئے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا تعلق بھی خالص ہندو تہذیب و کردار سے ہے۔ اس نظم میں ایک بیوہ کو شادی کا پیغام اور اسکا جواب نہایت پاکیزہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہت پہلے ہندو مذہب میں ستی کا رواج عام تھا۔ یعنی اگر کوئی شوہر مر جائے تو اس کی بیوی کو بھی شوہر کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ لیکن وہ النسانیت سوز رسم اب باقی نہیں ہے پھر بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ جو عورت بیوہ ہو جاتی ہے وہ دوسری شادی نہیں کرتی اسے شوہر کی صد درجہ اطاعت و محبت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ نظم خاصی طویل ہے اسلئے اختصار کے ساتھ کچھ منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

" دو آئینے " (جگت موہن لال رواں) روحِ رواں صفحہ ۱۲۲

حالِ دل وہ ہے کہ کہنا جسے آسان نہیں
اور خاموش بھی رہنے کا اب امکان نہیں

اسلئے اب تمہیں لکھتا ہوں یہ خط اے پیاری
کہ نہ واقف ہو مرے حال سے دنیا ساری

پوچھ لو دل سے جو مانو یہ ہمارا کہنا ہے کٹھن بات جوانی میں اکیلے رہنا

چشم بد دور تمہارا ابھی سن ہی کیا ہے ابھی کیا لطف اٹھائے ابھی کیا دیکھا ہے

جذبۂ دل کا خمار آنکھوں میں جب پاؤ گی آئینہ دیکھ کے خود آپ ہی شرماؤ گی

ایک دو زخم نئے ہر روز دکھانے کیلئے
موسم آئیں گے جلے دل کو جلانے کیلئے

دوپہر کی وہ اداسی وہ پہاڑ ایسے دن کاٹے کٹ جائیں اکیلے یہ بھلا کب ممکن

دن اگر کٹ بھی گیا رات کٹے گی کیونکر جسکی اک اک گھڑی ایسی ہیکہ روز محشر

ساتھ لاتی ہے بہاروں کے جھمیلے برکھا
کیسے کاٹو گی مری جان اکیلے برکھا

دل دھڑک جائیگا بادل کے کڑک جانے سے دل دہل جائیگا کوندے کے لپک جانے سے

گھاؤ پر گھاؤ لگائینگے پپیہے اکثر پھول سے گال پر منڈلائیں گے بھونرے اکثر

کسی صورت سے جو برسات کا موسم گزرا اک رخ کچھ اور بڑھا دیگا گلابی جاڑا

دل کو برمائیگی جب باغ میں کوئل کی صدا کچھ خبر ہے تمہیں کیا حال تمہارا ہوگا

بھول کر جو ہمن لوگی سبتی ساری دیکھنے آئینگی ہم جولیاں باری باری

کچھ برا ماننے کی بات مری جان نہیں
عمر عصمت سے گزر جائے یہ آسان نہیں

(بیوہ کا جواب) روح رواں صف ۱۲۸

اک مجبور کی تسلیم ادب ہو جو قبول نذر میں پیش کروں پاک خیالات کے پھول

آپ نے خط تو بہت خوب لکھا ہے لیکن سخت افسوس کہ اقرار نہیں ہے ممکن

زیب دیتا نہیں القاب مجھے پیاری کا | یوں دکھاؤ نہ دکھاؤ کسی دکھیاری کا
جان کہنا کسی بیگانے کو دستور نہیں | یہ کرم ایسی عنایت مجھے منظور نہیں
میری قسمت میں اگر عیش کا ساماں ہوتا | کیوں گلستاں مری نظروں میں بیاباں ہوتا
رات دن اسطرح مجھکو نہ رلاتے سوامی | اسطرح دکھ میں مجھے چھوڑ نہ جاتے سوامی
یہی بہتر ہے کہ اب آپ محبت نہ کریں | میری پھوٹی ہوئی تقدیر میں شرکت نہ کریں
ساتھ سوامی کے میرے دل کی ترنگیں بھی گئیں | میرے ارمان گئے میری امنگیں بھی گئیں
ساتھ سیندور کے سورس کی چتا پر رکھکر | پھونک دی میں نے جوانی بھی چتا پر رکھکر
آپ کہتے ہیں کہ موسم مجھے تڑپائیں گے | میں سمجھتی ہوں کہ پیغام وفا لائیں گے
کیا سنائیں گے پپیہے مجھے بانی اپنی | میرا ہی دکھ تو کہیں گے وہ زبانی اپنی
آپ کی عقل ہے تزئینِ وفا سے خالی | کہیں بیوہ بھی پہنتی ہے سنبتی ساری

گرچہ سائل پہ ہے دنیا میں کرم کا معمول
پھر بھی اس خط کو سمجھتی ہوں میں اک فکر فضول

جگت موہن لال رواں کی پیش کردہ تمام نظمیں ہندو معتقدات، تہذیب و تمدن کی پوری پوری عکاس ہیں اب ایک مسلمان شاعر و عالم مولانا ظفر علی خاں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے لئے محتاج تعارف نہیں ان کے کچھ کلام پیش کئے جا رہے ہیں انھوں نے اتحاد بین الہنود والمسلمین عنوان سے جو نظم کہی ہے اسمیں ہندو مذہب کی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے رہے ان کی تہذیب کی پامالی پر نہایت پر درد اور سبق آموز باتیں بتلائی ہیں، آپ بھی سنیئے اور سبق حاصل کیجیے مولانا ظفر علی خاں سوالیہ انداز میں کہتے ہیں کہ ؎

وہ تہذیب اے ہندو ہو گئی کیا؟ — بجا جسکا ڈنکا تھا دنیا کے اندر
ہوئی کیا وہ دولت کہ شوکت تھی اسکی — چمکتے ہیں بجلی گرجنے میں تیندر
کدھر چل دیا ہے تمہارا وہ کس بل — بنایا تھا ارجن کو جس نے سکندر
کہاں ہے وہ مشعل کسی وقت جس سے — پڑے جگمگاتے تھے کاشی کے مندر
کدھر گم ہوا ساغر اس ودیا کا — بہا جس سے تھا معرفت کا سمندر

جو گیتا ہی چشم بصیرت سے پڑھ لو
تو نورِ خدا دیکھ لو دل کے اندر

مولانا ظفر علی خاں نے شری رام چندر جی کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم کہی ہے جس سے مولانا کی رام چندر سے گہری عقیدت اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نہ تو ناقوس سے ہے اور نہ اصنام سے ہے — ہند کی گرمیِ ہنگامہ ترے نام سے ہے
میں ترے شیوۂ تسلیم پہ سر دھنتا ہوں — کہ یہ اک دور کی نسبت تجھے اسلام سے ہے
ہو وہ چھوٹوں کی عنایت کہ بڑوں کی شفقت — زندہ دونوں کی حقیقت ترے پیغام سے ہے
تیری تعلیم ہوئی نذرِ خرافاتِ فرنگ — برہمن کو یہ گلہ گردشِ ایام سے ہے

نقش تہذیب اگر اب بھی نمایاں ہے کہیں
تو وہ سیتا سے ہے لچھمن سے ہے اور رام سے ہے

پرارتھنا پر مولانا کے بھی چند شعر سنیئے فرماتے ہیں ؎

ہر ایک پرش ہو بھارت کا دوسرا ٹاگور — ہر استری کا تخلص سروجنی ہو جائے
ہر ایک شہر میں ہو ودیا کا زور اتنا — کہ دیس بھر میں جو کنگال ہے دھنی ہو جائے

کرشن اور بدھشٹر بنے ہر اک بالک ہر ایک کنیا سیتا و پدمنی ہو جائے

نہ امتیاز رہے ذات پات کا کچھ بھی

ہر ایک شودر کی لڑکی برہمنی ہو جائے

گوکل کی بانسری کی گونج "کے عنوان سے مولانا کہ ایک نظم کے چند اشعار سینئے جو ہندو مسلم اتحاد کے درس کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

اگر کرشن کی تعلیم عام ہو جائے تو کام فتنۂ گردوں تمام ہو جائے

بہ پاسِ خاطرِ ہم سایہ ہر دوار کی روح نثار حضرت خیر الانام ہو جائے

مٹائیں برہمن و شیخ تفرقے اپنے زمانہ دونوں کے گھر کا غلام ہو جائے

وطن کی خاک کے ذروں سے چاند پیدا ہوں بلند اسقدر اسکا مقام ہو جائے

سلیقہ بادہ کشی کا اگر ہو یاروں کو شکستِ توبہ کا بھی اہتمام ہو جائے

ہے اس ترانے میں گوکل کی بانسری کی گونج

خدا کرے کہ یہ مقبولِ عام ہو جائے

آیئے اب ایک مایۂ ناز اردو شاعر جناب درگا سہائے سرور جہاں آبادی کے مذہبی منظوم کلام جو ہندو معتقدات اور تہذیب و روایات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان پر نگاہ ڈالیں اس عظیم شاعر کو منظر نگاری میں کمال حاصل تھا اور جناب پنڈت دیا شنکر، شنکر دیال نسیم کے بعد سرور صاحب کا ہی درجہ متعین کیا جاتا ہے۔ موصوف کی نظم سیتا جی کی گریہ وزاری، کے کچھ اشعار پیش کیئے جاتے ہیں۔ جو اس وقت کی منظر کشی ہے جب شری رامچندر جی بن باس کیلئے اپنے ماں باپ سے رخصت ہو رہے تھے سیتا جی اسوقت رام جی

سے اپنے ساتھ رکھنے کی التجائیں کرتی ہوئی یوں مخاطب ہوتی ہیں ؎

"سیتا جی کی گریہ وزاری"

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ساتھ لے چلو
ریکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو

نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائیگا
چھوٹا تمہارا دیش تو جی چھوٹ جائیگا

گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو
پاؤ گے بن سے آ کے نہ جیتا غریب کو

ایسے تمہارے ساتھ پھروں گی میں بن میں خوش
بھنورا کلی کلی پہ ہو جیسے چمن میں خوش

پیتامبر سمجھ کے درختوں کی چھال کو
آراستہ کروں گی قد نونہال کو

سبزہ بنا کے لائیگا بستر مرے لئے
جھولا جھلانے آئیگی صرصر مرے لئے

صورت تمہاری دیکھ کے غم بھول جاؤں گی
صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤں گی

کرپاندھان مجھکو نہ دکھ درد لوگ کا
پروانہ کے پران نہ دکھ درد ویگ کا
تاریک تم بغیر ہے عالم مرے لئے
فردوس بھی ہے آہ جہنم مرے لئے ۔ ا‌رسرور جہاں آبادی از حکم چند نیر صفحہ ۳۰۲

سیتا جی پر ایک اور طویل نظم نوبت رائے نظر کی ہے جو راماین سے ماخوذ ہے اسکے کچھ منتخب بند پیش کئے جاتے ہیں۔ راماین تلسی داس کی تصنیف کردہ ایک مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ جسمیں رامچندر جی کے بن باس کے ۱۴ سالہ حالات بیان کئے گئے ہیں، جسمیں لنکا کی فتح یابی سیتا جی کی واپسی خود رام چندر جی کی گھر واپسی اور تخت و تاج سنبھالنے کی مکمل داستان ہے اس داستان کو ہندو اور مسلمان دونوں شعراء نے اردو زبان میں منظوم کیا ہے۔ چکبست نے تو بن باس

کے ابتدائی روانگی کا حال نظم کیا ہے، درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے سیتاجی کی گریہ وزاری پر گہر افشانی کی ہے لیکن نوبت رائے نظر نے ابتداء سے انتہا تک واقعات کی جو منظر کشی اپنی نظم میں کی ہے وہ مستحسن اقدام ہے چند بند درج ذیل ہیں ؎

نظم۔ "سیتاجی" (نوبت رائے نظر) انوار نظر صفحہ

تھیں دیویاں ہماری عفت مآب یکسر ۔ پڑھتی نماز حوریں دامن پہ جنکے اگر
جنت جنھیں میسر تھی زیر پائے شوہر ۔ وہ ہو فقیر کوئی یا شاہ ہفت کشور
یہ جانتیں اسی کو یہ مانتیں اسی کو
اپنا خدائے واحد گردانتیں اسی کو

ان دیویوں میں سیتا سرمایہ وفا تھیں ۔ جو رام چندر جی کی بانوئے خوش ادا تھیں
شمع حریم دل تھیں خورشید پر ضیا تھیں ۔ باطن میں ایک تھیں وہ ظاہر میں گو جدا تھیں
کاشانہ جہاں میں تھے رام شعلہ نور
نور ازل کی خاطر سیتا تھیں شمع کافور

سیتا کے عیش میں جب رخنہ فلک نے ڈالا ۔ اور رام کو محل سے بن باس کو نکالا تو
رخصت ہوا نظر سے گھر کا وہ سب اجالا ۔ روکا ہر اک نے ان کو خود رام نے بھی ٹالا
سائے کی طرح لیکن دنبال رام تھیں وہ
شام شب الم میں ماہ تمام تھیں وہ

صحرا میں رام و لچھمن پھرتے تھے بادل شاد ۔ سیتا تھیں ساتھ خوش خوش آئی نہ گھر کی کبھی یاد
بستی سے موڑ کر منھ جنگل کیا تھا آباد ۔ بن باس کی غرض تھی چودہ برس کی میعاد

نیکی سے انکی منوں جن بھی تھے اور بشر بھی
مانوس ہو گئے تھے جنگل کے جانور بھی

راون نے دیکے دھوکا جب رام سے چھڑایا   صحرا میں چار جانب سیتا کا رنگ چھایا
جنگل کو چھان ڈالا لیکن پتہ نہ پایا   پائی نہ گرد سیتا دیکھا نہ اس کا سایا

لچھمن انھیں اکیلا کیوں چھوڑ کر گئے تھے
بھائی کے جوشِ خوں سے لینے خبر گئے تھے

اے ساکنانِ صحرا سیتا کدھر گئی ہیں   اے کوہ و دشت و دریا سیتا کدھر گئی ہیں
اے آہوانِ رعنا سیتا کدھر گئی ہیں   مضطر ہے قلب شیدا سیتا کدھر گئی ہیں

ہوتی ہے شام اب تک ان کا پتہ نہیں ہے
منزل سے دور جانا اس دم روا نہیں ہے

تیر و کمان لاؤ دیکھو کہاں ہیں سیتا   کس پردۂ خفا میں آخر نہاں ہیں سیتا
حالت ہے زار ان کی یا شادماں ہیں سیتا   دل کو مرے یقیں ہے محوِ فغاں ہیں سیتا

اونچا ہے اس جہاں میں اے آسماں بتا دے
تیری نظر میں ہے تو سیتا کا کچھ پتہ دے

سیتا کے پاس پہونچے اس قید میں ہنومان   جو رام کے تھے قاصد سب مشکلیں تھیں آساں
دیکھا جو حال سیتا باقی رہا نہ اوسان   ظاہر میں تھیں وہ زندہ کہنے کو تن میں تھی جاں

رو رو کے تاب و طاقت ساری وہ کھو چکی تھیں
ملنے سے رام کے اب مایوس ہو چکی تھیں

نوبت رائے نظر کی نظم "سیتا جی" آپ نے دیکھی جو ہندو تہذیب و اعتقاد کی جیتی جاگتی تصویر ہے اب ایک سرور انگیز نظم "لکشمی جی" جناب سرور جہاں آبادی کی پیشِ خدمت ہے قومی شاعروں میں سرور صاحب ایک امتیازی اور انفرادی حیثیت رکھتے ہیں مزید براں سرور صاحب قدیم ہندوستانی روایات اور دیو مالائی انداز عشق و محبت کو بہت عزیز رکھتے ہیں "لکشمی جی" ایک نعتیہ قصیدہ ہے جسکا تعلق ہندو دیو مالا سے ہے سرور صاحب نے پہلے لکشمی جی کا ایک حسین سراپا پیش کیا ہے سُنئے ؎

شبہ صورت وہ عجب تھی وہ عجب شبھ لگن — کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھاسن
ایک چکا چوند کا عالم دمِ نظارا تھا — گورا گورا تن نازک تھا سراپا کندن
تھی چمک کیا وہ ترے چاند سے رخساروں کی — کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیئے دو روشن
ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں کڑی دونوں بھویں — لئے پھرتے تھے کبھی بن میں انھیں رام لکھن
تیرے ماتھے پہ تھا چندن کا لگایا ٹیکہ — اپسروں نے کیا تھا ترے رخ پر ابٹن
اور کنول کے تجھے پھولوں کا نیا کر زیور — اُف رے مشاطہ گری تجھکو بنایا تھا دلہن
ناز تھا شاہدِ رعنائے ازل کو جن پر — تیرے حصے میں وہ بتّیس سے آئے ابرن
رخِ تاباں پہ برستا تھا ترے نورِ ازل — بن کے ساون کی جھڑی اور کبھی بھادوں کی پھبن
بھولی بھالی سی وہ صورت وہ ادائیں پیاری — نیچی نیچی وہ نگاہیں وہ انوکھی چتون
کوکلا سی وہ تری میٹھی سُریلی آواز — میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن
گوری گوری تھی جبیں بزم کی سندر کوئی نار — زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شیام برن
خوش نما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول — اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیب بدن

الغرض لکشمی جی جنھیں دھن دولت کی دیوی کہا جاتا ہے ہندو مذہب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ سرور صاحب نے ان کی قصیدہ خوانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ (سرور جہاں آبادی حیات و شاعری از حکم چند نیر صفحہ ۳۰۷)

رامائن فراقی

گذشتہ بابوں میں رامائن سے ماخوذ اردو منظوم تراجم جناب چکبست، رواں اور سرور صاحبان کے پیش کیے گئے اب اس سلسلہ کا اردو منظوم آج بالمیکی رامائن کا جناب سدھ ناتھ بلی فراقی نے کہا ہے جو اردو ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ فراقی صاحب نے کتاب کی ترتیب میں چار ابواب ① بال کانڈ ② اجودھیا کانڈ ③ ارن کانڈ ④ کشں کنڈ ما کانڈ بنائے ہیں یہ کتاب پانچسو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ نمونہ کے لیے ہر باب سے کچھ کچھ اشعار پیش کرتے ہیں جس سے قاری کو اس مذہبی کتاب کی اہمیت اور ہندو تہذیب و روایات کا بخوبی اندازہ ہو جائیگا۔ پہلے بال کانڈ، کے چند اشعار سنئے جو انھوں نے اپنی انکساری اور رامچندر جی سے گہری عقیدت کے بطور کہتے ہیں۔

سرجو ہے اور شہر اودھ قابلِ نثار جن کے بیان کرتے ہیں اوصاف دیوتا

سب ساکنانِ شہر ہیں وہ عرش مرتبہ پیارا جسے سمجھتا ہے دسرتھ کا لاڈلا

راہ وفا میں فکر وفا بھی کمال تھی

دیدی وہ جان ہجر میں جو بے مثال تھی

راجہ جنک ہیں قابل توصیفِ بے گراں رکھتے تھے دل میں رام کی الفت کو جو نہاں

ہر چند اہل ضبط ہے وہ فخر عاشقاں رگھو ناتھ جی کو دیکھتے ہی بے شک دگماں

راز نیاز و عشق کا اسرار کھل گیا
عقدہ جو حل طلب تھا وہ اک بار کھل گیا

جو کچھ بھرت کو آج سراہوں ہے سب بجا جو آپ کو سمجھتے تھے رگھوپت کی خاک پا
پایا بھی تخت و تاج تو پروانہ کی ذرا بھائی کی بندگی کا مقدم خیال تھا

رکھا نہ حدِّ فرض سے باہر قدم کبھی
ہرگز کیا نہ وضع کو بیش اور کم کبھی

اوصاف لکشمن کے بیاں کیا کرے کوئی حاضر ہے جان و دل سے جو خدمت میں رام کی
دکھ درد میں بھی ترکِ رفاقت نہ کی کبھی مدنظر اطاعتِ شہ دم بدم رہی

قوت سے بازوؤں کی تو حق بھی ادا کیا
خود کو نثار منزلِ عشق و وفا کیا

غرض اسی طرح رام بھگتوں کے نام ہستر ہن، بھرت، رنجی، سگریو، بال، بھیکھن، ریچھوں کا سردار جمونت، لشن، شنکر، گنیت جی، شیو جی وغیرہ نہایت احترام و عقیدت مندی کے ساتھ گنائے ہیں اور ان کے حالات و صفات کا ذکر کرتے ہوئے جانکی جی اور رام کی شادی پر ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

سنئے فراقی آپ سے اب پردہ کیا رہا رام و سیتا کا حال جو میں نے بیان کیا
نام اس سے زندہ رہتا ہے صاحب کلام کا ہوتی زبان پاک ہے بے شبہ و بے ریا

ورنہ صفاتِ رام و سیا بے شمار ہیں
عاجز دم سخن یہاں بذلہ نگار ہیں

اب دوسرے باب اجودھیا کانڈ کے بھی چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جسمیں رام جی کی شادی کی خوشی سے اجودھیا کی ہر شے معمور نظر آتی تھی اور خاص بات یہ بھی ہے کہ رام جی کی شادی اور خوشنودی کی خبر جب رانی کیکئی کو ملی تو وہ حد درجہ پریشان ہو کر دسرتھ جی کو اپنے قریب میں لاکر رام جی کو بن باس کا حکم صادر کرا دیا۔

کیا کیا خوشی میں ڈوبی ہوئی تھی اجودھیا   ایسا سیا کو بیاہ کے تھے رام خوش عطار

گھر گھر نشاط و عیش کا ہنگامہ تھا بپا   ہر خاص و عام نشۂ شادی سے چور تھا

معمور نعمتوں سے تھا زر اور مال سے

رشکِ ریاضِ خلد تھا دسرتھ کے لال سے

سُن سُن کے دیکھ دیکھ کے اوصاف رام کے   کیا کیا بسشٹ و شاہ اودھ شاد ہوتے تھے

سب مانگتے دعا تھے یہ پروردگار سے   شہ کردیں رام ولی عہد سامنے

یارب ہماری عرض تمنا قبول کر

ہم پر تو اپنی بخشش و رحمت نزول کر

لیکن رام جی کی شادی کی خوشیوں اور ولی عہد کی خبر سنکر رانی کیکئی کی التجا سنیئے۔

فرمایا کیکئی نے کہ اے میرے غم ربا   دل کا جو اقتضا ہے وہ اب کیجئے وفا۔

کرتی ہوں ہاتھ جوڑ کے حضرت سے التجا   یعنی بھرت ہوں راجہ انھیں راج ہو عطار

یہ التماس دوسری بھی دست بستہ ہے

لونڈی کے واسطے جو مبارک خجستہ ہے۔

درویش کے لباس میں رام فلک نشیں   چودہ برس قیام کریں بن میں بالیقیں۔

سنتے ہی غم میں ڈوب گئے خسروِ زمیں　　جسے شعاع مہر سے ہوتا ہے ذل حزیں

فرطِ الم سے کہہ نہ سکے کچھ زباں سے تو

دھو بیٹھے ہاتھ اپنے ہی ہاتھوں وہ جان سے

آگے بن باس کا حال اور آخر میں بھرت جی کی ملاقات بالتفصیل بیان کرتے ہوئے اجودھیا کانڈ ختم ہوتا ہے اور پھر تیسرا باب ارن کانڈ کا آغاز کرتے ہوئے چترکوٹ کے ذکر میں جہاں رام جی رُکے تھے اور سیتا جی کو جسنیت نے زخمی کر دیا تھا پھر تب رگھوناتھ جی نے جسنیت سے کہا کہ وہ رام جی کے پاؤں پر گر کر معافی مانگے۔ جسنیت نے ایسا ہی کیا اور معافی مل گئی اور رام پھر چترین کی راہ لی جسے اشعار میں یوں بیان کیا ہے ؎

کی خسروِ زمانہ نے بھی اتر کی شار　　دکھ راج نے لگا لیا سینے سے دی دعا

برسائے آسمان نے پھول اور دی صدا　　جے آپ کی ہوائے شہ ذی جاہ خوش عطا

رخصت جناب اترے رام و لکھن ہوئے

پھر عازم سفر شہ لشکر شکن ہوئے

جاتے تھے آگے آگے شہنشاہ ذوالمنن　　تیر و کماں لئے ہوئے پیچھے تھے لکشمن

کیا تھی لباس فقر میں بے ساختہ پھبن　　نیلا تھا جسم رام کا لچھمن تھے سیم تن

جلوہ فگن تھیں بیچ میں سیتا جی اسطرح

یا ہو کے مابین جس طرح

الغرض چترکوٹ سے روانہ ہو کر رام اور لچھمن تیج بٹی کے بن میں جا پہونچے اور وہیں قیام کیا جہاں سورپ نکھا نے رام چندر جی اور لکشمن جی سے مایوس

ہو کر اپنی خوفناک صورت دکھائی جس سے سیتا جی ڈر گئیں تب لکشمن جی نے سوروپ نکھا کے ناک کان کاٹ لئے وہ روتی ہوئی کھر سے مدد طلب کی اور کھر نے ایک بڑی فوج لیکر رام جی پر حملہ کر دیا اور پھر سیتا جی کو طلب کیا جس سے لڑائی ٹھن گئی جو چند اشعار میں درج ذیل ہیں۔

آئے جو ہر بے دشمنوں کے شہ کے سامنے　　اک ایک کو شہ نے تیروں سے دو ٹکڑے کر دیئے
پھر ایسے تیر سر کیئے شاہِ انام نے　　پھنکارتے ہوئے جو چلے مثل سانپ کے

ان خوفناک تیروں سے گھبرا کے راکشش
سب آ کے رزم گاہ میں پچھتائے راکشش

پائی جو فتح رام نے خوش ہو گیا جہاں　　گردوں سے دیوتاؤں نے کیں گلفشانیاں
سیتا کے ساتھ آ گئے سو ستر ذی شاں　　خوش خوش گلے لگا کے ملے ماہ کن فکاں

سیتا جی شاد ہو گئیں دیدار شاہ سے
کرنے لگیں نگاہ محبت سے چاہ سے

اب آخر میں چوتھے باب کشکندھا کانڈ کی ابتدا، فراقی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اے طبع نکتہ سنج بہارِ سخن دکھا　　اے فکرِ تازہ جلوۂ رنگ چمن دکھا
اے ذہن سیر رفعت چرخ کہن دکھا　　اے نطق آبدارئ درِ عدن دکھا

آمد ہے رکھ لوک پر دسرتھ کے لال کی
کچھ اور ہی بہار ہے دشت و جبال کی

رام اور لکھن کے وہاں پہونچنے پر فراقی صاحب نے وہاں کی منظر کشی کے بعد بتلایا ہے کہ پہاڑ پر ایک طرف سگریو اپنے ہم رکابوں کے ساتھ تھا جس نے رام اور

لکشمن کو دیکھکر سوچا کہ کہیں یہ لوگ بال کے ہمدرد تو نہیں یہ معلوم کرنے کے لئے ہنومنت کو بھیجا۔

پہونچے لکھن کیساتھ شہنشاہِ ذی وقار | رہتا تھا اس پہاڑ پہ سگریو دلفگار
آتے ہوئے نظر جو پڑے اسکو شہریار | بالی کے خوف سے ہوا خالف وہ ایکبار

آیا خیال دلمیں پھر اس خستہ حال کے
ایسا نہ ہو کہ ہوں یہ مددگار بال کے

سگریو نے کیا جو غم و درد کا بیاں | بس سُن کے آبدیدہ ہوئے خسروِ جہاں
جوش تہور اور شجاعت سے بے گماں | بازو پھڑک اٹھے ہوئے گویا کہ مہرباں

دیکھو کروں گا دور تمہارے ملال کو
ماروں گا ایک تیر سے بے شبہ بال کو

سگریو ہاں کا تخت و تاج سونپ کر سیتا جی کی تلاش کرنے اور لنکا کو فتح کرنے تک کے حالات نہایت خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں داستان ختم کر رہے ہیں۔ آخری بند ملاحظہ کیجئے ؎

ہر سو جہاں میں اس کی شجاعت کی ہوگی دھوم | ہوگی ستم سے پاک یہ لنکا کی مرز بوم
چھائیگا رعب شاہ اودھ کا علی العلوم | چھپ جائیں گے جو اہلِ ستم ہیں مثالِ بوم

اقبال یہ رہے گا نہ لنکا کے شاہ کا
بیٹھے گا سکہ خسروِ عالم پناہ کا

مذہبی اور تہذیبی موضوعات پر درشن سنگھ نے بھی نظمیں کہی ہیں لیکن انھوں نے قدیم اندازِ فکر کی بجائے جدید طرز اختیار کیا ہے، ان کی نظم بن باس جو جدید

طرز پر کہی گئی ہے، چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

بن باس

انسانوں کا کام نہیں ہے — سیتا کو تم آگ میں ڈالو[1]

سچا عزم بھلا کب ہارا — کندن اور دمک اٹھے گا

فرماں برداری محکم ہے — جوہر اور چمک اٹھے گا

ایفاء وعدہ مشکل ہے — باطل جتنا زور کرے گا

سچائی کب ٹوٹ چکی ہے — جاگ اٹھے گا جب بھی راون

ہر راون کی آگ کا شعلہ — ایک دھنس آپ سے آئے گی

ہر راون کے غیظ کی اگنی — چھاتوں میں لہرے گا اک آنچل

راون کے طوفان کا لشکر — سوئے ارماں جاگ اٹھیں گے

راکششوں کی خونی آندھی — سارے انساں جاگ اٹھیں گے

[1] حادۂ نور صفحہ ۱۴۴

درشن سنگھ کی دوسری آزاد نظم جو شری کرشن جی پر کہی گئی ہے آخری بند ملاحظہ کیجیے ؎

ازلی ہے میرا ہتھیار بھی بن جاتی ہے — صدا

عہد نو کے یہ ستم گار یہ انساں دشمن

فتح پا سکتے نہیں روح کی سچائی پر

جاگ اٹھی ہے نظر بھیم کی ارجن کی کماں

جسم کمزور ہیں روحوں میں توانائی ہے

حق کے پرچم کو، جواں عزم نہ جھکنے دیں گے
قافلہ عہد بہاراں کا نہ رکنے دیں گے
ایک طاقت ہے یہ آتی ہوئی مدھوبن کی صدا
کوئی طاقت اسے مفتوح نہیں کر سکتی
یہ تو ہر عہد میں ہر روح کو گرماتی ہے
بانسری دور سے پیغام دیئے جاتی ہے

بھگوان مہابیر"، جنھیں ہندو دھرم میں ایک اوتار کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جناب درشن سنگھ کے ان پر یہ بھی نظم کہی ہے۔ جو شاعر کی عقیدت مندی کی جھلک کا اظہار کرتی ہے۔ ؎

"جیو اور جینے دو"

دوا زندگی کی بتاتے ہیں ویر
رہنا کا رستہ بتاتے ہیں ویر
جیو اور جینے دو سنسار کو
محبت کی باتیں سکھاتے ہیں ویر
جو بڑھتی ہیں نفرت کی چنگاریاں
دیا آتما کا جلاتے ہیں ویر
کہیں کیوں نہ بیدار پیغامبر
کہ سوتے ہوئے کو جگاتے ہیں ویر

؎ جادۂ نور صفحہ ۱۵۱

بڑے نرم دل ہیں کہ جاندار کو
ستم کی چھری سے بچاتے ہیں ویر
ستمگار و ظالم جھکاتے ہیں سر
وہ طاقت کا جلوہ دکھاتے ہیں ویر
زمانے کی کانٹوں بھری راہ میں
محبت کی کلیاں کھلاتے ہیں ویر
کرم کرتے ہیں جان حیوان پر
بشر کو گلے سے لگاتے ہیں ویر

نہیں رہتی مشکل کوئی سامنے
کہ درشن کو درشن دکھاتے ہیں دیر

درشن سنگھ نے مہاتما بدھ پر بھی ایک آزاد نظم کہی ہے جسکا عنوان ,,مینار دانش،، ہے۔ چند شعر اس نظم کے بھی سنیئے، جن کا تعلق خاص معتقدات سے ہے۔

مینار دانش (درشن سنگھ)

پھر وہی دھوپ وہی دھوپ کا جلتا میداں جسمیں سایا ہے نہ ٹھنڈک ہے نہ روحوں کا سکوں
زخم اجسام کے رستے ہوئے ناسوروں پر اے تشدد کے خداؤ کوئی مرہم بھی نہیں
ظلمتیں محو تصادم ہیں مگر کیا حاصل اسطرح کیا شب گیتی کا سویرا ہوگا
جمع ہو جاؤ اسی امن کے پرچم کے تلے کہ یہ پرچم نہیں مینارۂ تابانی ہے
کہ جسے دانش گوتم نے جلانے کے لئے اپنے پاکیزہ امر ہاتھ سے تعمیر کیا
کبھی ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا یہ مینارۂ نور
روشنی دل کو دکھاتا ہی چلا جائیگا۔

ہندو دھرم میں شری رام چندر جی اوتار مانے جاتے ہیں اور ہندو لوگ خدا کی طرح ان کی پرستش کرتے ہیں۔ دھنپت رائے راز جو اردو کے مشہور شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شری رام چندر جی بھگوان کے عنوان سے ایک نظم کہی جسمیں راز صاحب نے اپنی عقیدت کے پھول اسطرح نچھاور کئے ہیں[2]

[1] جادۂ نور صفحہ ۱۴۸ ــــ درشن سنگھ

ہر گھڑی لب پہ میرے رام کا نام آتا ہے دل مضطر میرا آرام وسکوں پاتا ہے
رام کو یاد ہر اک وقت کیا کرتا ہوں رام کے نام سے سرمست رہا کرتا ہوں

جاگتے سوتے ہیں ہے یاد اس کی دل میں ہے وہی میرا مددگار ہر اک مشکل میں

اسکے ہی فیض سے آباد ہر اک بستی ہے اسکے ہی مہر سے یہ میری تیری ہستی ہے

وہ جو چاہے تو، ہم اک پل بھی نہیں جی سکتے کھا بھی سکتے نہیں کچھ پانی نہیں پی سکتے

پاک اس دھرتی کو دشٹوں سے وہ کرنے آئے دکھی دینوں کی وہ ہر کشٹ کو ہرنے آئے

مارا ہر دشٹ کو راون کو بھی ادھار کیا

پاپ ساگر میں پڑے تھے جو انھیں پار کیا

جنابِ دھنپت رائے راز لائل پوری نے ایک نظم دیوالی کے سلسلہ میں لکھی ہے جسمیں اس وقت کا سین بیان کیا ہے جب رام چندر جی نے راون کو مار بھگا کر لنکا فتح کیا اور بن باس کی مدت پوری کر کے گھر لوٹے تو اس وقت اجودھیا میں دیوالی منائی گئی، جو روشنی کا تہوار کہا جاتا ہے

مارا راون کو تو سب راج ببھیشن کو دیا بھیجا لچھمن کو کہ لے آئیں وہ خود جا کے سیا

سیتا جی آئیں تو لی اگنی پریکشا ان کی گھر کو تب لوٹنے کی سب کو اجازت دیدی

سیتا اور رام و لچھمن آپ اجودھیا چلے ساتھ سگریو، ہنومان، ببھیشن ہی تھے

یوں تو ہنومان سے بولے تم آگے جاؤ مرے آئنگی اجودھیا میں خبر پہونچاؤ

کاٹ کر چودہ برس بن سے ہوئے واپس رام خوش ہوئے جھوم گئے باسی اجودھیا کے تمام

خود بھرت اٹھے شری رام کو لینے کے لئے کر کے پرنام شری رام کے درشن پائے

دیپ روشن ہوئے ہر گھر میں ہوئی دیوالی کھل گیا باغ اجودھیا کا جو آیا مالی

۱؎ کائناتِ راز صفحہ ۲۱ و صفحہ ۲۲ کائناتِ راز ۲؎

جناب دھنپت رائے راز نے بھگوان پرشو رام، کے تئیں اپنی عقیدت مندی کا

اظہار کرتے ہوئے چند اشعار کہے ہیں جو ہندو تہذیب کے عکاسی بھی ہیں۔ ۵

ایک اوتار پرشو رام جی تھے — کرتی کاری تھے اور ہنوی تھے

بڑھ گئے جب کہ حد سے اتیاچار — اس گھڑی آپ کا ہوا اوتار

رشی جمد اگنی کے بیٹے تھے — باہوں میں ایک بل سمیٹے تھے

کتنے ہی ظالموں کو ناش کیا — عرصہ میں جب اٹھالیا پرسا

زینوں کا جی تھیں آپ کی ماتا — حکم غصّے میں جب پتا نے دیا

کاٹ دو سر تم اپنی ماتا کا — رام نے حکم باپ کا مانا

رشی جمد اگنی نے خوش ہوکر — کہا بیٹے سے مجھ سے مانگو ور

ور یہ مانگا کہ جی اٹھے ماتا — ہو نہ کوئی میرے مقابل کا

رشی نے راز دیدیئے وردان

جن سے عالم ہے پرشو رام نشان

شہرۂ آفاق ملک الشعراء کالی داس کی عدیم المثال منظوم تصنیف ہے جسمیں حسن وعشق کی رنگینی رومان وعرفان اور منظر نگاری کے علاوہ قدیم ہندو تہذیب و تمدن کی منھ بولتی تصویر ہے جس کا اردو زبان کے نامور شاعر جناب منور لکھنوی نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جس پر عرش ملسیانی، فراق گورکھپوری جوش ملیح آبادی اور دوسرے ادبا و ناقدین نے تعارف لکھے ہیں سب سے مختصر تعارف یا تبصرہ جناب جوش ملیح آبادی نے کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ سبھاگی کتاب سنگم ہے دو ادبی جولانیوں کا اسمیں کالی داس نے تخیل

کی تابانی اور حضرت منور لکھنوی کی گہربار سحر بیانی کیساتھ ہم آہنگ ہے جیسے کسی محو خواب نازنیں کے ہار کے موتیوں میں پچھلے پہر کے چاند کی شبنمی چاندنی،، اور جناب عرش ملسیانی فرماتے ہیں کہ ،، منور لکھنوی کو قوت ترجمانی مکمل طور پر عطا ہوئی تھی اسکا اعتراف سب کو ہے کالی داس کی سمبھو کمار کا جو ترجمہ منور صاحب نے کیا ہے اس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ شیو جی اپنی رفیقۂ حیات کی موت پر تارک الدنیا ہو گئے۔ یہ دیوی دوبارہ ہمالیہ پہاڑ کی بیٹی اُما یا پاربتی کی شکل میں پیدا ہوئی نارو نے پاربتی کو اسکے مستقبل سے آگاہ کیا چنانچہ پاروتی نے مسلسل بھگتی اور ریاضت کے بعد شیو جی کی محبت حاصل کی۔ دونوں کی شادی ہوئی اور کمار یعنی سوامی کارتک پیدا ہوئے۔ (کائنات راز صفحہ ۲۳-۲۴)

منور صاحب نے اس کتاب کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے سب سے پہلے انھوں نے پاروتی کے جس سراپا کی منظر کشی نہایت خوبصورتی سے کہا ہے جسمیں تخیل کی تابانی اور محاکات کے حسین امتزاج نے بڑی دلآویزی پیدا کردی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

اک عجب کیف کا عالم ہے فضا میں جسکی | نازنینوں کی ہے رفتار ہوا میں جسکی

اف وہ انداز نگاریں کا مزہ دے جانا | جھاگ گنگا کی ترنگوں کا اڑا لے جانا

اس کی ہر جنبش مستانہ غضب ڈھاتی ہے | دیودار وں کے درختوں کو ہلا دیتی ہے

اسکے جھونکے جگر و دل میں اتر جاتے ہیں | پر تھرکتے ہوئے موروں کے بکھر جاتے ہیں

لوٹنے کو وہ کرات اس کی بہار آتے ہیں

اس علاقہ میں جو مصروف شکار آتے ہیں

پاروتی جی جب لڑکپن سے گزر کر جوانی کے حدود میں قدم رکھتی ہیں تو مترجم کا انداز بیان بھی ایک حسین موڑ اختیار کرتا ہے۔ غور کیجئے۔

شاملِ عمر تھی فردوس کے گلشن کی بہار
چمن آرائے جوانی ہوئی بچپن کی بہار

عہد پرکیف یہ بے کیف شراب آپہونچا
جس سے مستی ہوئی پیدا وہ شباب آپہونچا

نکہت گل کی لطافت تھی سبک پائی میں
جاں ستاں تھی یہ ادا اور بھی رعنائی میں

دم رفتار کچھ اس طرح قدم پڑتے تھے
شرم سے سرو سہی زیر زمیں گڑتے تھے

ناخن پا مہ پر نور کو شرماتے تھے
خود تقاضائے نزاکت سے جو اٹھ جاتے تھے

ساغر بادۂ انوار چھلک جاتا تھا
قرمزی رنگ انگوٹھے کا جھلک پڑتا تھا

سراپا کے کچھ جزئیات کا دل آویز اور پر کشش انداز ملاحظہ کیجئے

شانِ محبوبی تو خیر کے شایاں انداز
مست آنکھوں میں کنول کے تھے نمایاں انداز

سینۂ صاف نہ تھا حسن کا گنجینہ تھا
آب زرجسمیں بھرا تھا یہ وہ آئینہ تھا

سرکشی موجۂ طوفاں میں تھی پیدا کیا کیا
تنگ تھا اپنے حصاروں سے یہ دریا کیا کیا

سرمئی رنگ ہوا تھا سرِ دل پر ان کے
سرمۂ جان سویدا تھا سرِ دل پر ان کے

ان تھی دلآویز نزاکت کیا کیا
دیدۂ شوق پہ ڈھاتی تھی قیامت کیا کیا

ان کا حصہ تھا بہت حسن کی طراری میں
ہیچ تھے پھول سرس کے بھی لچکداری میں

خوشنما سلک گہر زیب گلو تھی کیا کیا
حلقہ زن اسمیں تھی اک جوئے تجلی کیا کیا

بلبلے سے تھے نمودار اس آئینے پر
موتیوں کی یہ خوش آبی تھی عجب سینے پر

اک طرف سلک گہر غیرت صد چشمۂ آب
اک طرف سرکشی کنگرۂ برج شباب

پاروتی کی شادی شیوجی کے ساتھ ہو جانے کے بعد مہادیو جی نے دیوتاؤں کو اپنے گھر جانے کی رخصت دیدی اس کی منظر کشی بھی آگے دیکھئے۔

دیوتاؤں کو مہادیو نے رخصت دیدی — جائیں اب اپنے گھروں کو یہ اجازت دیدی
خود چلے آئے ادھر پاروتی کے ہمراہ — عیش جاوید کا نظارہ ہوا پیش نگاہ
ہو گئے خواب گہہ پاک میں داخل دونوں — دست بازو کو بنائے تھے حمائل دونوں
ابھی آئی تھیں اماں بیاہ کے تازہ تازہ — رونما پھول سے گالوں پہ تھا غازہ تازہ
شیو نے خلوت میں بصد شوق جو الٹا گھونگھٹ — جھٹ سے منھ موڑ کے گوری نے سنبھالا گھونگھٹ

(مذکورہ بالا نظم میں)

جناب منور لکھنوی نے پاروتی جی کے سراپا کے جزویات کا پرکشش منظر پیش کیا ہے اردو شاعری میں سراپا نگاری لفظی مصوری کا ایک خوبصورت فن ہے جسمیں بہت سے اردو شعراء نے اپنے جوہر دکھائے ہیں جناب منور لکھنوی، سرور جہاں آبادی اور جناب جوش ملیح آبادی خاص طور پر امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔
لیکن نظیر اکبر آبادی کی شان مصوری کچھ اور ہی قدر و قیمت رکھتی ہے ہم یہاں نظیر کی نظم "پری کا سراپا" کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج کرتے ہیں جو ہندی الفاظ اور تشبیہات سے مالا مال ہے۔

خونریز کرشمہ ناز و ستم غمزوں کی جھکاوٹ ویسی ہی — مژگاں کی سناں نظروں کی انی ابرو کی کھچاوٹ ویسی ہی
قتال نگہہ اور دشت غضب آنکھوں کی لگاوٹ ویسی ہی — پلکوں کی جھپک پتلی کی پھرت سرمے کی لگاوٹ ویسی ہی
عیار نظر مکار ادا تیوری کی چڑھاوٹ ویسی ہی

تھی خوب ڈوپٹہ کی سر پر سنجاف تمامی کی الٹی — بلدار لٹیں تطویر جبیں جکڑی مینڈھی بیچ کنگھی

دل لوٹ نہ جائے کیوں کر اور دیکھ نہ نکلے کیونکر جی — وہ رات اندھیری بالوں سے وہ مانگ چمکتی بجلی سی

زلفوں کی کھلت پٹی کی جھپٹ چوٹی کی گندھاوٹ ویسی ہی

بیدرد ستمگر بے پروا بیکل چنچل چٹکیلی سی — دل سخت قیامت پتھر سا اور باتیں نرم رسیلی سی

آنکھوں کی بان ہٹیلی سی کاجل کی آنکھ کٹیلی سی — وہ انکھیاں مست نشیلی سی کچھ کالی سی کچھ پیلی سی

چتون کی دغا نظروں کی کپٹ سینوں کی تراوٹ ویسی ہی

کلیات نظیر صفحہ ۲۵۷ - ۲۵۸

اس کافر بینی اور نتھ کے انداز قیامت شان بھرے — اور گھیرے چاہ زنخداں میں سو آفت کے طوفان بھرے

وہ نرمے صاف ستارا سے اور موتی سے داماں بھرے — وہ کان جواہر کان بھرے کن پھولوں بالے جان بھرے

بندے کی لٹک جھمکے کی جھمک بالے کی ہلاوٹ ویسی ہی

چہرے پر حسن کی گرمی سے ہر آن چمکتے موتی سے — خوش رنگ پسینے کی بوندیں سو بار جھمکتے موتی سے

ہنسنے کی ادا میں پھول جھڑے باتوں میں ٹپکتے موتی سے — وہ پتلے پتلے ہونٹ غضب اور دانت چمکتے موتی سے

پاؤں کی رنگاوٹ قہر ستم دھڑیوں کی جماوٹ ویسی ہی

اس سینے کا وہ چاک ستم اس کرتی کا تن زیب غضب — اس قد کی زینت قہر بلا اس کافر چھب کا زیب غضب

ان ڈبیوں کا آزار براں گیندوں کا آسیب غضب — وہ چھوٹے چھوٹے سخت کچیں وہ کچے کچے سیب غضب

رنگیا کی بھڑک لوگوں کی جھمک بندوں کی کساوٹ ویسی ہی

اس گورے گورے سینے پر وہ گہنے کی گلزار کھلی — چمپے کی کلی ہیرے کی جڑی توڑے جگنو ہیکل بدھی

دل لوٹے تڑپے ہاتھ ملے اور جلے نظر ہر دم پھیلی — وہ پیٹ ملائی سا کافر وہ ناف چمکتی تارا سی

شوخی کی گھلاوٹ اور ستم شرموں کی چھپاوٹ ویسی ہی

کچھ ناز و ادا کچھ مغروری کچھ شرم و حیا کچھ بانک پنا — کچھ آمد حسن کے موسم کی کچھ کافر حسن رہا گدرا

کچھ شور جوانی اٹھتی کا چڑھتا ہے امنڈ کر جوں دریا وہ سینہ ابھرا جوش بھرا وہ عالم جسکا جھوم رہا

شانوں کی اکڑ جوبن کی تکڑ بیچ دھیج کی سجاوٹ ویسی ہی

جب ایسے حسن کا دریا ہو کس طور نہ لہروں میں بہیئے گر مہر و محبت ہو بہتر اور جور جفا ہو تو سہیئے

دل لوٹ گیا ہے غش کھا کر بس اور تو آگے کیا کہیئے مل جائے نظیرؔ ایسی جو پری چھاتی سے لپٹ کر سو رہیئے

بوسوں کی جھپک بغلوں کی لپک سینوں کی ملاوٹ ویسی ہی

ہندو معتقدات و تہذیب معاشرہ کے سلسلہ میں بہت سے شعراء نے رامچندر جی پر نظمیں کہی ہیں جنھیں گذشتہ ابواب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کچھ اور موضوعات پر گفتگو کریں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے جنھیں شاعر اسلام بھی کہا جاتا ہے۔ رامچندر جی کی شان میں اپنی عقیدت مندی کا جس طرح اظہار کیا ہے اس پر نظر ڈالنا چاہے

رام

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند

یہ ہندوؤں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند

اس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اسکو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا

پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

علامہ سر محمد اقبال کی ایک سبق آموز نظم "نیا شوالہ" ہے جسمیں انھوں نے ہندو مسلم قوموں کی آپس کی نفرت کو ختم کرنے نقشِ دوئی مٹانے اور بچھڑے دلوں کو پھر رشتہ محبت میں جوڑنے کی نصیحت کی ہے وہ کہتے ہیں

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے

تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا

جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا

واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں

بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی

آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں میں اونچا ہو اپنا تیرتھ

دامان آسماں سے اسکا کلس ملادیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے

سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے

دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

منظوم اردو تراجم کے سلسلہ میں پچھلے باب میں جناب شیشور پرشاد منور لکھنوی کے کالیداس کی مشہور تصنیف "سنبھو کمار" کا اردو ترجمہ منظوم آپ نے دیکھ لیا جسمیں انھوں نے پاروتی جی کے حسن و جمال کا بچپن سے جوانی تک ایک حسین انداز میں سراپا بیان کیا ہے۔ منور لکھنوی صاحب نے نسیم عرفان کے نام سے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے اور انھوں نے گوتم بدھ کے دھرم اپدیشوں کی روح دھمپد میں کھینچ کر رکھدی، سچی راہ اسی مقدس کتاب کا منظوم اردو ترجمہ ہے یہ حقیقت ہے کہ منور صاحب کے مذہبی کتابوں و تراجم کو اردو نظم کا جامہ پہنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ایک عظیم رہبر مہاتما بدھ کی اہم ترین کتاب کے کچھ منظوم اردو ترجمے منور صاحب کے اشعار میں دیکھئے۔

گوتم بدھ

یہ کسکے جلوہ بیدار سے پیدا ہے کیفیت
جلال مہر تاباں میں جمال ماہ انور میں

خدا لاکھوں کا ہے یہ دیوتا ہے گو ہزاروں میں کا
نہ مسجد میں مقید ہے نہ ہے محبوس مندر میں

یہ کسکی جنبش لب مانع پیکار باہم ہے
یہ سناٹا ہے کیوں چھایا ہے جانبازوں کے لشکر میں

نہ کر پایا کسے کاشی کا علم و فضل آسودہ
کسے الجھن ہوئی ویدوں کی تقلیدوں کے چکر میں

فرشتے دست بستہ کس کے گرد و پیش رہتے ہیں
یہ ہستی کیا ہے وہ سب جسکو گوتم بدھ کہتے ہیں

دھیند یا یہی راہ میں منور صاحب نے پہلی گفتگو (نیک و بد کا مقابلہ) میں کہتے ہیں۔

دھرم گرنتھوں سے کیا حاصل ان کا پڑھنا ہے لاحاصل
ان کو عمل میں لائے نہ جب تک عیش پرستی جائے نہ جب تک
ایسا انساں ہے اک گوالہ گائیں پرائی دوہنے والا
اس کا بیڑہ پار نہ ہوگا وہ پھل کا حق دار نہ ہوگا

بے معنی ہے ایسا پڑھنا
بے مصرف ہے اسکا پڑھنا

دوسری گفتگو (عمل کی فضیلت)

جو مصروف عمل رہتے ہیں وہ بے خوف اجل رہتے ہیں
جو بھی کام سے گھبراتا ہے جیتے جی ہی مر جاتا ہے

۳ تیسری گفتگو (دل کی تربیت) ۴ چوتھی گفتگو (پھولوں کا استعارہ)
پانچویں گفتگو (جہالت کا نتیجہ) چھٹیں گفتگو (پنڈت عالم کا بیان)
ساتویں گفتگو (تارک کامل کا بیان)

اسی طرح بہت سی گفتگوئیں اور ترجمے ہیں گیتا اور کمار سنبھو کی طرح ترجمے میں اردو شاعری کے مروجہ حسین جمیل پابندیوں کا احترام کرتے ہوئے کیے گئے ہیں سارے ابواب اعمال کردار سے متعلق ہیں۔

سہتھ

رامائن

اردو زبان کے نامور شاعر اصغر حسین خاں نظیر نے والمیکی رشی کے مشہور زماں رامائن کا مفہوم اردو نظم میں بیان کرنے کے علاوہ مہابھارت، ویدویاس رشی کی مشہور رزمیہ (والمیک کی رامائن) مہابھارت کا لب لباب بھی اپنی اردو نظم میں پیش کیا ہے۔ نظیر صاحب والمیک رمائن کے بارے میں کہتے ہیں۔

اے والمیک شاعر عہد قدیم ہند — روشن ہے تیری فکر سے ابتک حریم ہند
تیری نوا میں گم ہے بہشت نعیم ہند — تیرے نفس سے عطر فشاں ہے شمیم ہند
افکار کو ثبات ہے تن بے ثبات ہے — تو خاک میں بھی ملکے بقید حیات ہے
اسلوب گو غریب ہے بندش سے شاندار — افکار کا شمار ہے اک لاکھ دس ہزار
تیرا قلم ہے یا ہے کلید در بہار — گم ہیں تیری نواؤں میں صحرا و کوہسار

ہندوستاں کا بلبل شیریں سخن ہے تو
ہومر کیطرح شاعر عصر کہن ہے تو

اسکے بعد شاعر نے راجہ دسرتھ کی سلطنت سے آغاز کلام کرتے ہوئے کہا ہے کہ

قائم اودھ کے دیس میں باشان و احتشام — دسرتھ کی سلطنت تھی اجودھیا تھا جسکا نام
سرکار حق پرست تھی خوش حال تھے عوام — ہر سمت ہن برستا تھا بھارت میں صبح و شام

محتاج کوئی تھا نہ کوئی دردمند تھا
اس سلطنت کا بول جہاں میں بلند تھا

راجہ دسرتھ کی سلطنت کا ذکر کرنے کے بعد نظیر صاحب بھگوان رام کا لڑکپن سیتاجی کا سوئمبر، شادی کے بعد اجودھیا میں درود بھگوان رام کی ولی عہدی، بن باس

راجہ دسرتھ کی وفات سروپ لکھا کی مراجعت ۔ سیتاجی کی گم شدگی لنکا پر چڑھائی اور فتح یابی کے بعد آخر میں جپ مالا اور درسِ عمل کے منظوم اشعار کے ساتھ راماین اختتام کو پہونچتی ہے ۔

اردو منظوم تراجم کے سلسلہ میں اردو کا ایک باکمال شاعر الفت ایمن آبادی کا نام مشہور ہے ۔ جیسے سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا ۔ انھوں نے سنسکرت ، اشلوک اور اپنشد والمیک ، ایاس ، کالی داس اور بھر تھری وغیرہ کے جستہ جستہ ترجمے اپنی کتاب سب رنگ میں کیا ہے ۔ اور یہ منظوم تراجم انگریزی اور اردو زبانوں میں ہیں ۔ پہلے انھوں نے اشلوک کا عنوان متعین کیا ہے ۔ پھر نثر میں اردو ترجمہ کے بعد انھیں منظوم کر دیا ہے ۔ جیسے عنوان ہے " ذات احد " ، رباعی میں منظوم ہے ۔ (اشلوک ہے

ہر تن میں رچی اور بسی اک ذات	ہر روح میں موجود خفی ہے اک ذات
وہ ناظرِ اعمال ٹھکانا سب کا	آپ اپنی صفت زندہ رہی ہے اک ذات

الفت ایمن آبادی سب رنگ صفحہ ۱۹

اشلوک کا عنوان خوش قسمتی ہے

ترجمہ رباعی میں

قسمت تیرے کردار کا حصہ ہوگی
آئینہ تیرے ذوق عمل کا ہوگی
حاصل کے طلبگار تو اتنا تو سمجھ
بن بیج کے کھیتی میں اُپج کیا ہوگی

لہ صفحہ ۲۲ سب رنگ

سوم پیران، عنوان تسکین، مفہوم ذیل کے اشعار

دل پہ جب تک ہے لذائذ کا فسوں سبز رنگ صفحہ

تجھکو ناممکن ہے حاصل ہو سکوں

طالب عشرت، تعیش کا خیال

حاصل روحانیت ہیں یہ ستوں

اپنی جانب سے تو کچھ کہتا نہیں

استفادہ کیسے شعر دل سے کروں

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں

این خیال است و محال است و جنوں

عنوان تشویش ۶/۷

رباعی

آتے ہی مصیبت کے جو گھبرا جائے سبز رنگ صفحہ ۳۱

آفت کے تصور سے جو تھرا جائے

اس شخص کو تشویش ڈبو دے جیسے

اک بیڑا لدے بوجھ سے ڈوبا جائے

۶/۷/۷۲

اس اشلوک کا عنوان زندہ دلی ہے ترجمہ رباعی میں

مایوس سا مغموم سا جینا کیا ہے

ہر لطف سے محروم سا جینا کیا ہے

ہونٹوں پہ تبسم ہے نہ چہرے پہ جلال

منحوس اک بوم سا جینا کیا ہے   سب رنگ صفحہ ۳۰

عنوان ایمان وانسان

رباعی

جس طور کا رجحان ہوا کرتا ہے

اس طور کا ایمان ہوا کرتا ہے

جس رنگ کا ہوتا ہے عقیدہ اس کا

اس رنگ کا انسان ہوا کرتا ہے .   سب رنگ صفحہ ۳۶

بھگوت گیتا۔ اشلوک کا عنوان استقلال مفہوم حسب ذیل

بالیقینی کا ارادہ ایک نیت مستقل

کام کرنے کا طریقہ ایک حکمت مستقل

بے یقینی کے ارادے لغزشیں کھاتے رہیں

نت نئے اسمیں خیال آتے رہیں جاتے رہیں   سب رنگ صفحہ ۳۷

بھگوت گیتا اشلوک ۲۸/۱۱   عنوان موج زندگی ترجمہ رباعی میں

جس طور پہاڑوں سے نکل کر ندیاں

ہوتی رہیں سمندر کیطرف تیز رواں

اس طور لگاتار عدم کی جانب

اڑتی رہی چلی جائے حیات انساں   سب رنگ صفحہ ۳۹

گیتا ۱۵/۶۶ عنوان، ایک وعدہ، مفہوم اشعار قطعہ ذیل

سر سے افکار کے انبار گرا کر آجا

وسوسے دل سے بھرا کبار مٹا کر آجا

ایک میں ہی تجھے دکھڑوں سے بچا سکتا ہوں

میرے دامن میں کبھی خوف بھلا کر آجا — سب رنگ صفحہ ۴۲

اسطرح کے بہت سے تراجم اور بھی ہیں لیکن مزید تفصیل درکار نہیں

تاریخی واقعات وحادثات سے متاثر ہو کر جناب درگا سہائے سرور جہاں آبادی نے ایک خطابیہ قصیدہ چتوڑ کی عظمتِ رفتہ بھی لکھا ہے جسکے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

خاک میں تیری بسالت کے وہ جوہر ہیں کہاں — سرنگوں ہے اب زمیں پر تیری عظمت کا نشاں

رزم گہہ میں باندھ کر اپنی ہوا دو چار دن — کھول کر کیوں رکھدی تو نے اپنی تیغ خوں فشاں

اب وہ مغفر ہے نہ بکتر ہے نہ جوشن ہے نہ خود — تیرے مہردانِ دل ور کے وہ زیور ہے کہاں

او کمان کش یاد کر کے کارناموں کو تیرے — روتی ہے رکھ رکھ کے چلہ تیر کا منھ پر کماں

دل میں گھر کرتی نہیں اب تیرے نیزوں کی خلش — نوک کی لیتی نہیں ہیں اب وہ تیری برچھیاں

بجھ کے ٹھنڈی ہو گئیں خوں میں وہ تیغ آبدار — آگ جسمیں تھی کبھی دوزخ کی شعلوں کی نہاں

حیات اور شاعری سرور جہاں آبادی
ڈاکٹر حکم چند نیر صفحہ ۳۱۹

ہندو تہذیب وعقائد ان کی مذہبی مقدس کتابیں اور تراجم۔ ہندو پیشواؤں اور مذہبی اہم شخصیتیں، متبرک مقامات وغیرہ کے بارے میں پچھلے ابواب میں بالتفصیل ذکر ہو چکا ہے۔ اردو شاعری کے ان تمام پیش کردہ کلام سے جو ہندو مسلمان شعراء کے مشترک اور ملے جلے ہیں یہ بات یقینی طور پر

ظاہر ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں ہندو تہذیب پوری رعنائی کے ساتھ عکس ریز ہے اب آگے ہندوستان کی طبعی اور جغرافیائی جائزے یہاں کے دریا، پہاڑ، موسم کے تذکرے کے بعد ہندو تقریبات مثلاً راکھی۔ بسنت، دسہرہ ہولی۔ دیوالی، میلے ٹھیلے وغیرہ پر اردو نظمیں پیش کی جارہی ہیں۔

لیکن موضوع بدلنے سے پہلے ہندوستانی زبانوں کی سب سے قدیم صنف "دوہے"، کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو بدھ مت اور جین مت کے جوگیوں اور سنیاسیوں کی تخلیق کردہ ہے تلسی داس، کبیر داس۔ امیر خسرو اور بابا فرید نے اس صنفِ سخن کو اپنا کر لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے ہندی کی اس طرز ادا کو اردو سخنوروں نے بھی ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت دی ہے۔ پرتو روہیلا نے موجودہ دور میں بہت ہی متاثر انداز میں دوہے کہے ہیں۔ متھرا یاترا کے عنوان سے ان کے چند دوہے سنیئے۔

گوری آئی متھرا جی سے کر گنگا اشنان
بستی میں پرشاد بٹے ہیں کھیل تماشے پان
گوری کے اک ہاتھ میں مالا دوجے گنگا جل
میری سمجھ کا پھیر ہے الیشور یا ہے روپ کا پھل
گوری دان سے پہلے لوگو اپنا مول بتائے
یہ تو ہوا بیوپار سکھی ری پریم کہاں کہلائے
دان میں زور ازوری کیسی مرضی تیری پیاری
ہم تو روپ کی بھکشا مانگیں بن کر ایک بھکاری

رین اجیارا ص ۱۵۵
پرتو روہیلا

باب ۳

وطنیت کے جذبات سے معمور ڈاکٹر محمد اقبال کی نظم ترانۂ ہندی جس کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار دہلوی نے بحوالہ امرت باقی کہا ہے کہ گاندھی جی کو اقبال کی شاعری بہت پسند تھی ان کی نظم (سارے جہاں سے اچھا) انھیں خاص طور سے پسند تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی نظم کے بارے میں کہا کہ میں اس نظم کی زبان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں ہندی، ہندوستانی یا اردو ممکن ہے میں اپنے بچار میں اکیلا رہوں لیکن یہ بات صاف ہے کہ یہ نہ سنسکرت ہے نہ ہندی نہ فارسی آمیز اردو یہ صرف ہندوستانی ہے جسکی آخر کار جیت ہونے والی ہے یہی بچار انھوں نے ۶/جون ۱۹۳۶ء کو وردھا سے محمد حسین کے نام اپنے ایک خط میں ظاہر کئے ہیں

ترانۂ ہندی (علامہ اقبال)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جنکے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبرودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپسمیں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے — ابتک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ جہاں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں

معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندوستانی راشٹر بھاشا اور نیگو افرچکا۔ ڈی، سی، دلیش کمھ صفحہ ۱

ہمالہ

کلیات اقبال بانگ درا صفحہ ۲۱

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے

تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو

مطلعِ اول فلک جسکا ہو وہ دیواں ہے تو — سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر

خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن — وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن — تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن

چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے

دامنِ موجِ ہوا جسکے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے — دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر

فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اسکی خامشی دستِ گلچیں کی جھٹک دیکھی نہیں میں نے کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ میرا

کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ میرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی کوثر و تسنیم کی موجوں کی سرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو

اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٔ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا دامنِ دل کھینچتی ہے آبشار دل کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ داستاں اسوقت کی کوئی سنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا

کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جسپر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو

دوڑ پیچھے کیطرف اے گردشِ ایام تو

مادرِ ہند

قومی اور وطن پرست شاعر جناب سرور جہاں آبادی نے وطن کی عظمت کے گیت اسطرح گائے ہیں جیسے حب الوطنی ایک سچی دیش بھگتی اور پوجا کی چیز ہے۔ مادرِ وطن سرور صاحب کی نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

واہ یہ جاں بخش پانی یہ ہوائے خوشگوار — یہ تر و شاداب و شیریں میوہ ہائے خوشگوار
ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں ڈوبی ہوئی بادِ جنوب — سبز کھیتوں کی فضائیں اور یہ میدانوں کے دوب

ظلِّ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق دراز
خاک پر کیا کیا تری تیرے مکینوں کو ہے ناز

ہاں یہ تیری چاندنی راتوں کا منظر خوشنما — واہ یہ اشجار یہ پھولوں کے زیور خوشنما
سو تبسم تیرے اندازِ تکلم پر نثار — دل کو کرتی ہیں تری دلکش صدائیں بیقرار

سرزمینِ عیش ہے اے مادرِ دل سوز تو
آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز تو

سبزۂ خود رو کا گہوارہ ہے تیری سرزمیں — تختۂ خلدِ بریں ہے تیری خوش منظر زمیں
پاک گنگا جل سے بڑھ کر ہے ترا آبِ طہور — تیرے پاکیزہ ثمر ہیں میوۂ شاخِ سرور

آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو
خلد کی ہے پاک دیوی مادرِ دمساز تو

نوجوانوں کی ہے ہمت تو دلیروں کی سپر — کانپتے ہیں دشمنوں کے تیری ہیبت سے جگر
نورِ دانش تو فروغِ جلوۂ ایماں ہے تو — دل ہے تو سرمایۂ صبر و شکیبِ جاں ہے تو

قوتِ بازو ہے میری مادرِ غم خوار تو
سینۂ ہر فرد میں ہے میرے نفس کا تار تو

تیرا دیوستھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے
تیری تصویرِ مقدس ہر صنم خانے میں ہے

لکشمی تو ہے زمانے میں اجالا ہے تیرا
ہر کنول کا پھول پانی میں شوالا ہے تیرا

سرسوتی کا روپ ہے درگا کا ہے اوتار تو
اور دانش کی ہے دیوی مادرِ غم خوار تو

اف یہ سندر چھب تیری یہ سانولی مورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی صورت تیری

سرور جہاں آبادی، حیات و شاعری از ڈاکٹر حکم چند نیر صف ۱۹۸

عروس حب وطن

" جناب ڈاکٹر حکم چند نیر کہتے ہیں کہ سرور عروس حب وطن کے ایک جانباز پجاری ہیں ان کے یہاں وطن کو قدر اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے انھوں نے جذبۂ حب الوطنی کو زندگی کا سب سے زیادہ اشرف و اعلیٰ جذبہ کہا ہے" وطن کیلئے سرور صاحب کی محبت اور پرستش کا جذبہ ملاحظہ ہو

آ اے عروس حب وطن میرے بر میں تو
آنکھیں تیری تلاش میں ہیں محو جستجو

آ اے نگار تجھکو گلے سے لگاؤں میں
آ تجھ سے ہمکنار ہو اے شوخ خوب رو

تیری شراب عشق کا آنکھوں میں ہو سرور
خلوت میں ہو نہ ذکر مے و شیشہ و سبو

لپٹوں میں بے خودی میں جو تجھ سے شب وصال
باہیں تیرے گلے میں ہوں لب پر یہ گفتگو

ٹوٹیں وہ پاؤں جنکو نہ تیری تلاش ہو
پھوٹے وہ آنکھ جسکو نہ ہو تیری جستجو

وہ گھر ہو بے چراغ جہاں تیری ضو نہ ہو
وہ دل ہو داغ جسمیں نہ ہو تیری آرزو

ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں
اس کے لیے کہ جسکا پرستش کدہ ہے تو

گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو
تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو

تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخ خوبرو　　　تیرا طریق عشق ہی ایمان ہے میرا

جلوہ نہ ہو کسی بت رعنا کے سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

ڈاکٹر حکم چند نیر پھر کہتے ہیں کہ اسلامی عہد حکومت کی شان و شوکت کے مٹنے اور دلی کے سر سے جہانداری کے سہرے اترنے کا انھیں انتہائی غم تھا اسکا ماتم سرور سے زیادہ شاید ہی کسی نے کیا ہوگا۔ کہتے ہیں یہ صرف ایک سلطنت کے مٹنے کا غم نہیں تھا بلکہ ایک بے مثل تہذیب اور عظیم الشان کلچر کی اس جگمگاتی شمع کے بجھنے کا ماتم ہے جسکے سامنے مہر و ماہ کی تابانیاں ماند تھیں،،

سرور صاحب کے چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

سرور جہاں آبادی حیات و شاعری ڈاکٹر حکم چند نیر صفحہ ۲۰

جس پہ لہرایا کیا صدیوں تک اسلامی نشاں
نذرِ طوفاں ہو گیا وہ تختۂ عہد کہن

خانہ ویرانی برستی ہے در و دیوار پر
نقش عبرت اب ہیں آثار صنادید کہن

رزم میں بھی گل کھلاتی جنکی تیغِ خونفشاں
ان کے مرقد پہ ہے پھولا لالۂ خونیں کفن

چھپ گئے کتم عدم میں کیسے کیسے حکمراں
لگ گیا افسوس کس کس ماہ کامل کو گہن

سر پہ دلی کے جہانداری کا سہرا اب کہاں
شاہد ماتم نشیں ہے اب یہ البیلی دلہن

خاک ہند

عروس حب وطن کے پرستار جناب سرور جہاں آبادی کے ایک اور نظم خاک وطن کے کچھ اور اشعار پیش کیے جاتے ہیں دیکھیے۔

سرور جہاں آبادی

آہ اے خاکِ وطن اے سرمۂ نورِ نظر | آہ اے سرمایۂ آرائشِ جانِ جگر
تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول | گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول
جب مسلط خلق پر تھی خوابِ غفلت کی گھٹا | موتی برساتی تھی تجھ پر ابرِ رحمت کی گھٹا
رفعت بامِ فلک تھی تیری پستی میں نہاں | عظمتِ خود تھی سراپا اوجِ ہستی میں نہاں
جب تمدن کا بندھا عالم میں شیرازہ نہ تھا | شاہد قدرت نے جب رخ پر ملا غازہ نہ تھا
بادۂ تہذیب سے خالی تھا جب یورپ کا خُم | ایشیا کا آہ جب بیڑا تھا تاریکی میں گُم
جب نہ تھی یونان میں علم و ہنر کی روشنی | جلوہ افروزِ خرد تھی تیرے گھر کی روشنی

(خاک ہند) حیات و شاعری سرور جہاں آبادی صفحہ ۲۰۲ - ۲۰۳ از عکم چندیز

آہ اے خاکِ وطن اے دردمند بیقرار | آہ اے شوریدہ قسمت اے پریشاں روزگار
اڑ رہا تھا پرچم شہرت ترا افلاک پر | سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اس خاک پر
تیری شہرت کے نگیں خاکِ عدم میں ہیں نہاں | اب نہ وہ تخت مرصع ہے نہ تاجِ زرفشاں

جھلملا کر بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ
ہیں جگر کے داغ اب تیری شبستاں کے چراغ

وطن کی سرزمیں

ایک اور نظم وطن کی سرزمیں بھی سرور صاحب نے اپنے اسی مخصوص انداز یعنی عورت کے جسمانی حسن و جمال کی محبوبہ بنا کر خطاب کرتے ہیں۔

آہ او عفت کی دیوی اور وطن کی سرزمیں
آسماں کی او پری فردوس کی او حورِ عین

تیری شاخوں کا لچکنا آہ وہ مستانہ وار

جھومتی ہو نشہ میں جیسے کوئی ناز آفریں

پیاری پیاری آہ کوئل کی سریلی وہ صدا

جیسے گائے زہرہ وش کوئی لب جو بھیر وین

آسماں کے منھ پر آنچل بدلیوں کا خوشنما

ہلکی ہلکی بادلے کی وہ نقابِ ریشمیں

وہ تبسم برق کا اور کالی کالی وہ گھٹا

لیلیٰ وش اک نازنیں اک بت خندہ جبیں

وہ کسی کی کمسنی کی ننھی کلیوں میں ادا	بھینی بھینی ان میں نکہت شاہد پردہ نشیں
شانِ محبوبی تھی کیا کیا اے وطن کی سرزمیں	تجھ میں رعنائی تھی کیا کیا اے وطن کی سرزمیں

حیات و شاعری سرور جہاں آبادی حکم چند نیر صفحہ ۱۴

ملک کی تعریف میں جناب پنڈت برج نرائن چکبست نے بھی خاک ہند نظم لکھی ہے جو ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ چکبست مذہبی، اخلاقی اور اصلاحی نظموں کے علاوہ ملک کے قدیم ناموس کو جگانا بھی چاہتے تھے لکھنؤ کی صاف شستہ زبان استعمال کرتے تھے۔ خاکِ وطن کے چند اشعار سنئے

"خاک وطن"

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے	دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہے	اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی

کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو — سرمد نے اس زمیں پر صدقہ کیا وطن کو

اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو — سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں

ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا — اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

اسکے بھرے خزانے برباد ہو رہے ہیں

ذلت نصیب خواب غفلت میں سو رہے ہیں

اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری — چین و عرب میں جس سے ہوتی تھی آبیاری

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا زہر طاری — چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہیں تھی جب یوناں کی انجمن میں

تاباں تھا مہر دانش اس وادی کہن میں

دیوار و در سے ابتک ان کا اثر عیاں ہے — اپنی رگوں میں ابتک ان کا لہو رواں ہے

ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے — فردوس گوش ابتک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ ابتک

شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ پھر کان کو سنا دے

مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر

سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

ہے جوئے شیر ہمکو نور سحر وطن کا آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزل کہن کا تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو

مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

قومی شاعری کے سو سال اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۲ء

قومی شاعر جناب ڈاکٹر محمد اقبال کی ایک مختصر سی نظم جو ہندوستانی گیت ہے

پیش کرتے ہیں

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا

نانک نے جس زمیں میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جسکو اپنا وطن بنایا

جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جسنے حیران کر دیا تھا

سارے جہاں کو جسنے علم و ہنر دیا تھا

مٹی کو جسکی حق نے نور اثر دیا تھا

ترکوں کو جس نے دامن ہیرے سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے

پھر تاب دیکے جس نے چمکائے کہکشاں سے

وحدت کی لَے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کا سینا

نوحِ نبی کا ٹھہرا آکر جہاں سفینا

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا

جنّت کی زندگی ہے جسکی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

حوقومی شاعری سو سال اردو اکیڈمی لکھنؤ صفحہ ۱۶۴

وطن اور وطن کی ہر شے سے پیار، وطن کی خاک ہمالیہ، وطن غرض مختلف عنوان سے ہمارے شعرا نے ترانے گائے ہیں اور وطن سے اپنی محبت کا اظہار مختلف طریقوں سے کئے ہیں ان ساری کی ساری نظموں کو اس کتاب میں لکھنا مقصود نہیں۔ بس اب ایک نظم جناب تلوک چند محروم کی ''خاک ہند'' آپ کے سامنے پیش کر کے آگے بڑھیں گے۔

''خاکِ ہند''

انجم سے بڑھ کے تیرا ہر ذرہ ضوفشاں ہے
جلووں سے تیرے ابتک حسن ازل عیاں ہے

اندازِ دلفریبی جو تجھ میں ہے کہاں ہے
فخرِ زمانہ تو ہے اور نازشِ جہاں ہے

افتادگی میں بھی تو ہم اوجِ آسماں ہے

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

وہ کج کلاہ تیرے وہ سُورہ بیر تیرے ۔۔۔ وہ تیغ زن کماں کش وہ قلعہ گیر تیرے

بیدا آج گو ہیں تاج و سریر تیرے ۔۔۔ شاہوں سے ہیں زیادہ لیکن فقیر تیرے

پستی میں سربلندی سب پر تیری عیاں ہے

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

تجھکو مٹا دیا ہے ہرچند آسماں نے ۔۔۔ پھونکا ہے آہ دل کو سوز غم نہاں نے

چھوڑی نہ تاب اپنی حسن دل ستاں نے ۔۔۔ جوہر بھرے ہیں تجھ میں صناعِ دوجہاں نے

فصل خزاں ہے تیری پھر بھی تو خوشنما ہے

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

قومی شاعری کے سّو سال اردو اکیڈمی صفحہ ۲

ہندوستان کی ندیاں گنگا اور جمنا کا تذکرہ جغرافیائی حیثیت کے علاوہ ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کی مقدس علامتوں کا اہم ترین حصہ ہے۔ سب سے پہلے جناب درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی نظم جمنا کے کچھ خوبصورت اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

سرور صاحب کی شاعری کا ایک حسین ترین پہلو یہ ہے کہ جامد ہو یا رواں ہر چیز کو وہ جسم جماں کی حسین دیوی کے روپ میں محسوس کرتے ہیں اور قدیم ہندوستانی دیو مالا میں عشق و عاشقی کی پاک روایتوں سے کام لیتے ہوئے نظم کہتے ہیں اور اپنے جمال پرست تخیل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"جمنا"

آہ او رنگیں ادا او دلّی والی نازنیں ۔۔۔ وہ دو عالم کے حسینوں سے نرالی نازنیں

دھیمی دھیمی وہ تری رفتار بل کھائی ہوئی — وہ نظر جھینپی ہوئی چتون وہ شرمائی ہوئی

وہ حسینوں سے نرالی تیری البیلی روش — دل پہ جادو کرنے والی تیری البیلی روش

برج کی او پاکدامن او مقدس نازنیں — نقش ہے دل پر تیری اک اک ادائے دلنشیں

کون یہ پردہ نشیں ہے تیرے دامن میں نہاں — کس کا چہرہ ہے نقاب زلفِ پرفن میں نہاں

تیری موجوں میں ہے یہ کسکی صدائے دلفریب — گا رہی ہے کون یہ غارتگرِ صبر و شکیب

خانۂ دل میں ہے تیرے کون محو رقصِ ناز — آرہی ہے کسکی چھاگل کی صدائے جاں نواز

وہ سمن اندام ہے یہ شاہد پردہ نشین

جسکے پھولوں میں ہے ابتک بوئے فردوس بریں

اسی طرح سرور صاحب نے گنگا جی کو مخاطب کیا ہے اسکے بھی کچھ اشعار منتخبہ پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

گنگا جی

او پاک نازنیں او پھولوں کے گہنے والی — سر سبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی

او ناز آفریں او صدق و صفا کی دیوی — او عفتِ مجسم پربت کی رہنے والی

حُسنِ ظہور تیرا ہے بے نیاز ہستی — تو بحر معرفت ہے اے پاک باز ہستی

یہ جوشِ سبزہ و گل یہ تیری آب یاری — قدرت کے چپہ چپہ پر تیری شگوفہ کاری

ہندوستاں کو تو نے جنت نشاں بنایا — نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری

اے آبرو دِ گنگا موجوں میں تیری ملکر — موج سراب ہستی ہو بے نشاں ہماری

بعد فنا ہمارے پھولوں میں بو ہو تیری — گم ہوں رہ طلب میں اور جستجو ہو تیری

جب ہونٹ خشک ہوں اور دشوار ہو تنفس — احباب اپنے منہ میں ٹپکائیں تیرا پانی

ہنستے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں   دنیا سے پی کے تیری الفت کا جام جائیں

سرور صاحب کی نظم گنگا جی آپ نے پڑھی آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ سرور صاحب کو گنگا سے کس درجہ عقیدت اور شیفتگی تھی اب ان کے چند اشعار پریاگ کا سنگم کے عنوان سے لکھی ہوئی نظم کے بھی سُن لیجئے۔ گنگا اور جمنا دونوں ندیاں پریاگ (الٰہ آباد) میں مل جاتی ہیں اسے دوآبہ یا پریاگ کہتے ہیں۔ پریاگ کا سنگم ہندوؤں کا متبرک مقام ہے جہاں اشنان کا میلا ہوتا ہے جسے مذہبی فریضہ کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔

پریاگ کا سنگم

جب صانع ازل نے صورت تیری بنائی   ہونٹوں کو جان بخشی آنکھوں کو جانفزائی

خاکہ بنا کے کھینچا نقشِ وجود تیرا   بول اٹھی چھین لوں گی دل شان دلربائی

بخشی تیری زباں کو نطق شکر فشانی   کچھ شہد کی حلاوت کچھ قند کی مٹھائی

۲۔ سرور جہاں آبادی از حکم چند نیر صف ۱۵ صف ۱۹۴

نقشہ بنا کے تیرا صانعِ دو جہاں نے   تصویر تیری چومی اور آنکھ سے لگائی

خلوت سے بن کے دولہن نکلی حیا جو تیری   آبِ رواں کی چادر ہلکی اک اڑھائی

گنگا بڑھی ادھر سے جمنا بڑھی ادھر سے   اجزائے حسن نے یوں ترکیب مل کے پائی

وابستہ ہو گئے دو دامان دل فریبی

دونی نہ آہ کیوں کر ہو شان دل فریبی

ایک مختصر سی چھوٹی بحر میں آزاد نظم رادھا کرشن گنگا پیاسی کے عنوان سے لکھی ہے ہمگل صاحب ہندو تہذیب کے علم برداروں میں ہیں، موصوف نے

ویدمنتروں کو بھی آزاد منظوم کیا ہے وہ اپنی بات بہت سہل اور آسان الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں

"گنگا پیاسی"[1]

لہراتی بل کھاتی گنگا — جٹا چھوڑ کے شیو شنکر کی
رشتہ توڑ کے کہساروں سے — پتھر پتھر راہ بناتی
پتھریلی راہوں پر رقصاں — موسم موسم گرمی سردی
ہنستی جاتی گاتی جاتی — جنگل جنگل صحرا صحرا
ساحل ساحل حیراں حیراں — طوفاں طوفاں سر ٹکراتی
ساگر سے ملنے کی خوشی میں — تشنہ لبوں کی پیاس بجھاتی
کھیتی کھیتی دھان اگاتی — اس بے پایاں بھو ساگر کا
ہر قطرہ ہے زہر قاتل — اسمیں امرت رس ٹپکاتی
پل پل چھن چھن شام سویرے — ساگر کی باہوں کی طالب
اشارے کی راگ میں کھوئی — اک دھارے پر بہتی جائے
سوئے منزل بڑھتی جائے — لہراتی بل کھاتی گنگا

[1] نشاط کر یہ رادھا کرشن سہگل صفحہ ۱۵۴

دریائے گنگا اور جمنا ہندوستان کی مقدس ندیاں کہی جاتی ہیں، بہت سے اردو شعرا نے ان پر نظمیں لکھی ہیں، ایک خوبصورت سی نظم دریائے گنگا پر جناب بدیع الزماں خاور کی بھی سنیے

گنگا

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت سازِ موج پر گاتا ہوا

دودھ کا گنگوتری سے جب چھلک جاتا ہے جام
اسکا امرت دھار میدانوں میں پڑ جاتا ہے نام
ہے مقدس ہند کے دامن پہ گنگا کا خرام

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت سازِ موج پر گاتا ہوا

آریوں کو اس کی لہروں کا زمانہ یاد ہے
کارو انوں کے اترنے کا فسانہ یاد ہے
قوم کی تہذیب کا پہلا ترانہ یاد ہے

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت سازِ موج پر گاتا ہوا

بہہ رہا ہے گردشِ ایام کا رُخ موڑ کر
فطرتِ آدم کی دوری کے فسوں کو توڑ کر
رشتۂ تاریخ کو جغرافیہ سے جوڑ کر

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے گیت سازِ موج پر گاتا ہوا

لہ میرا وطن ہندوستان صفحہ ۵۷ بدیع الزماں خاور

چھیڑتا جاتا ہے اس انداز سے سنگم کے راگ
ہوں پرانی لے میں جیسے اک نئے عالم کے راگ
اس کے لب پر جاوداں ہے عشرت باہم کے راگ

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے راگ موج ساز پر گاتا ہوا

اسکی زرخیزی پہ نازاں خود وطن کی خاک ہے
سینۂ ظلمات اسکی روشنی سے چاک ہے
دیوتاؤں کی طرح میرا یہ دریا پاک ہے

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے راگ ساز موج پر گاتا ہوا

اسکے دم سے ہے فروزاں آج چہروں کا جمال
کھیتوں کو آگیا ہے راس نہروں کا جمال
ہنس رہا ہے اسکے آئینے میں شہروں کا جمال

ایک دریا ہے رواں صدیوں سے لہراتا ہوا
زندگی کے راگ ساز موج پر گاتا ہوا

ہندوستان کی طبعی وجغرافیائی حالات واثرات کی وضاحت کے سلسلہ کی بہت سی نظمیں پیش کی جا چکی ہیں اب ملک کی موسمیات مثلاً جاڑا گرمی برسات وغیرہ کا جائزہ لینے کیلئے ہم پہلے جاڑا کے موضوع پر جناب نظیر اکبرآبادی کی نظم جاڑے کی بہاریں دیکھئے۔

جاڑے کی بہاریں

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا خم ٹھوک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوئی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سبکی بتیسی
ہو شور پھپھو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
کلّے پر کلّہ لگ کر چلتی ہو منھ میں چکّی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر چار طرف سے سردی ہو اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا
اور تن میں نیمہ شبنم کا ہو جسمیں خس عطر لگا
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا ہو آگے اک فراش کھڑا
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جب ایسی سردی ہو اے دل تب روز مزے کی گھاتیں ہوں
کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چٹکی لاتیں ہوں
کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش و طرب میں پلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہو فرش بچھا غالیچوں کا اور پردے چھوٹے ہوں آکر
اک گرم انگیٹھی جلتی ہو اور شمع ہو روشن تس پر
وہ دلبر شوخ پری چنچل ہے دھوم مچی جسکی گھر گھر
ریشم کی نرم نہالی پر سو ناز ادا سے ہنس ہنس کر
پہلو کے بیچ مچلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

ہر ایک مکاں ہو خلوت کا اور عیش کی سب تیاری ہو
وہ جان کہ جس سے جی غش ہو سو ناز سے آ جھنکاری ہو
دل دیکھ نظیر اس کی چھب کو ہر آن ادا پر جاری ہو
سب عیش مہیا ہو آکر ارمان کی جسمیں باری ہو
جب سب ارمان نکلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

(کلیات نظیر صفحہ ۵۶۷)

نظم جاڑے کی بہاریں کے بعد برسات کی جو امس گرمی سے پیدا ہوتی ہے جناب نظیر اکبر آبادی نے اسکا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

برسات کی امس

کیا ابر کی گرمی میں گھڑی پہر ہے ادمس گرمی کے بڑھانے کی عجب لہر ہے ادمس
پانی سے پسینے کی بڑی نہر ہے ادمس ہر باغ میں ہر دشت میں ہر شہر ہے ادمس

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے ادمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے ادمس

بدلی کے جو گھر جانے سے ہوتی ہے ہوا بند پھر بند سی گرمی وہ عجب پڑتی ہے یک چند
پنکھے کوئی پکڑے کوئی کھولے ہے کھڑا بند دم رک کے گھلا جاتا ہے گرمی سے ہر اک بند

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے ادمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے ادمس

ادھر تو پسینوں سے پڑی بھیگے ہیں ہاتیں گرمی سے ادھر میل کی کچھ چیونٹیاں کاٹیں
کپڑا جو پہنے تو پسینے اسے آئیں ننگا جو بدن رکھے تو پھر مکھیاں چاٹیں

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے ادمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے ادمس

رکنے سے ہوا کے جو برا ہوتا ہے احوال پنکھا کوئی آنچل کوئی دامن کوئی رومال
دم دھونکنے لگتا ہے لہاروں کی گویا کھال کچھ ادج کو بتا بیاں کچھ جان کو جنجال

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے ادمس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے ادمس

ہوتی ہے امس جو کبھی اک رات کو اگر
کر ڈالتی ہے پھر تو قیامت ہی مقرر

ادھر تو ہوا بند ادھر پسّو و مچھر
پانی کو کوئی پیوے تو آدھن سے بھی وہ بدتر

برسات کے موسم میں نپٹ زہر ہے اومس
سب چیز تو اچھی ہے پر اک قہر ہے اومس

حکمت نظیر صفحہ ۵۶۳

گرمی اور جاڑے کے بعد اب برسات کے موسم کا لطف نظیر صاحب بیان کرتے ہیں موسم برسات پر انھوں نے لطف لے لیکر کئی نظمیں کہی ہیں "برسات کا لطف" کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک نظم کے کچھ اشعار دیکھیں۔

"برسات کا لطف"

ساقیا موسم برسات ہے کیا روح فزا
دیکھ کچھ تازگی صنعت بے چون و چرا

جا بجا نکلے ہیں اس لطف سے طفلان نبات
اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے جنھیں نشو نما

کھل رہے ہیں در و دیوار پہ ابواب بہشت
آ رہی ہے چمن خلد کی ہر گھر میں ہوا

دیکھو سبزوں کی طراوٹ کو زمیں بڑھتی ہے
دم بدم انبتہ اللہ نباتاً حسنا

برگ اشجار وہ سرسبز ہیں اور نرم و لطیف
فی المثل حلۂ جنت انھیں کہیے تو بجا

الغرض دشت تو ہیں کارگہہ مخمل سبز
اور جو ہیں کوہ تو ان پر بھی زمرد سے فدا

ہے زمین و چمن و باغ جو پانی سی سفید
اسمیں اب عکس ہر اک گل کا ہے یوں جلوہ نما

عقل کہتی ہے تامل سے جسے دیکھکے یہ
طشت بلور ہے اقسام جواہر سے بھرا

شاخ پر گل سے یہ عالم ہے کہ جیسے محبوب
سرخ دستار لبسر دکھتا ہے اور سبز قبا

ہلتے اس لطف سے ہیں بھیلے ہوئے تازہ نہال جیسے ہو نازنیں دلبر کے نہانے کی ادا

اس طرح برسے ہے جھڑیوں کو لگا کر باراں منسلک جیسے ہو سلکِ گہرِ بیش بہا

اب میں ساون کی اندھیری کی کہوں کیا تعریف جعدِ شیریں کہوں یا زلفِ سیاہِ لیلا

کہیں رقاص کا رقص اور کہیں مطرب کا سرود کہیں ساقی مے و ساغر طرب و برگ و نوا

مور کا شور و فغاں غوک کی جھینگر کی جھکار پی پی ہر آن ہے کوئل کی پپیہے کی صدا

شہر اور دشت میں یوں چار مہینے تو نظیر

ہر برس ہوتے ہیں گل حسن طراوٹ ہر جا

کلیات نظیر صفحہ ۵۶

جناب نظیر اکبر آبادی کی ایک دوسری نظم برسات کی بہاریں کے کچھ اشعار بھی سنئے

بادل ہوا کے اوپر جو مست چھا رہے ہیں جھڑیوں کی مستیاں سے دھومیں مچا رہے ہیں

پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں

کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے

جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے بچھوا دیئے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے

کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

سبزے کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی

سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ تا بہ ماہی یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی

کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

بولیں بئے بٹیریں قمری پکارے گو گو پی پی کرے پپیہا بگلے پکارے تو تو

کیا بدبدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو　　سب رٹ رہے ہیں تجھکو کیا پنکھ کیا پکھرو

کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

اب سوگنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری　　ہر بوند مارتی ہے سینے اوپر کٹاری

بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں باری باری　　ہے ہے لیا بہانے اب کے بھی سدھ ہماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کلیات نظیر صفحہ ۵۵۰

"برسات کا موسم"

پھر جھوم کے میخانہ بدوش آئیں گھٹائیں

جذبات مچلنے لگے بدلیں جو ہوائیں

رت بدلی فضا ہو گئی گل بیز و معطر

ہر سمت کھنکنے لگے پیمانہ و ساغر

بدمست چلے آتے ہیں امڈے ہوے بادل

لیلائے شبِ کیف نے پھیلایا ہے آنچل

اک پھولجھڑی چھوٹی ترشح کے بہانے

قدرت بھی لٹانے لگی موتی کے خزانے

طاؤس نے پر کھولے چمکنے لگے جگنو

بن گونج اٹھا جست لگانے لگے آہو

یوں تشنۂ صہبائے مسرت کا بڑھا جوش

کوئل کہیں بے خود ہے پپیہا کہیں مدہوش

سنبل نے ادھر کاکل پیچاں کو سنوارہ

سبزوں نے ادھر فرش زمرد کا بچھایا

مہکے ہوئے گلزار ہے لہکے ہوئی صحرا

دہقانوں کی قسمت کا بھی چمکا ہے ستارا

کھیتوں میں چلے جاتے ہیں ہل بیل سنبھالے

قسمت کے ستائے ہوئے افلاس کی مارے

ہر رنج مسرت میں نظر آتا ہے مدغم

برسات کا موسم ہے یہ برسات کا موسم

آئینہ در آئینہ اختر انصاری صفحہ ۲۸

"راکھی"

ہندو مذہب اور ہندو مذہب کا محبت آفریں اور دلآویز تہوار راکھی ہے جسکی خوبصورت رسم یہ ہے کہ بھائی بہن ایک دوسرے کو اور دوست اپنے دوست کے باہوں میں راکھی باندھتے ہیں اب اس دلکش رسم پر راکھی کی بجائے خوبصورت پھول، موتیوں اور زری تاروں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہندو مذہب کے اس پاکیزہ رسم پر اردو کے ہندو مسلم شاعروں نے خوب خوب نظمیں یا غزلیں کہی ہیں نظیر اکبرآبادی کی نظم کے کچھ اشعار سنیئے

چلی آتی ہے اب تو ہر بازار کی راکھی — سنہری سبز ریشم زرد اور گلنار کی راکھی

بنی ہے خوب نادر گو کہ ہر سردار کی راکھی — سلونوں میں عجب رنگین ہے اس دلدار کی راکھی

تیرے پہنچے ایک گل یار جیس گلزار کی راکھی

عیاں ہے اب تو راکھی بھی چمن بھی گل بھی شبنم بھی　　جھمک جاتا ہے موتی بھی جھمک جاتا ہے ریشم بھی

تماشہ ہے ہا ہا ہا غنیمت ہے یہ عالم بھی　　اٹھانا ہاتھ پیارے واہ وا ٹک دیکھ لیں ہم بھی

تمہاری موتیوں کی اور زری کے تار کی راکھی

بجی ہے ہر طرف کیا کیا سلونوں کی بہار اب تو　　ہر اک گل رو پھرے ہے راکھی باندھے ہاتھ میں خوش ہو

ہوس جو دل میں گزرے ہے کہوں کیا ہائے میں تم کو　　یہی آتا ہے جی میں ملکے باہم آج تو یارو

میں اپنے ہاتھ سے پیارے کے باندھوں پیار کی راکھی

ہوتی ہے زیب و زینت اور خوباں کو تو راکھی سے　　لیکن تم سے اب جاں اور کچھ راکھی کے گل بوٹے

دیوانی بلبلیں ہوں دیکھ گل چن نے لگیں تنکے　　تمہارے ہاتھ نے مہندی نے انگشتوں نے ناخن نے

گلستاں کی چمن کی باغ کی گلزار کی راکھی

ادا سے ہاتھ اٹھتے ہیں گل راکھی جو ہلتے ہیں　　کلیجے دیکھنے والوں کے کیا کیا آہ پھٹتے ہیں

کہاں نازک یہ پہنچے اور کہاں یہ رنگ ملتے ہیں　　چمن میں شاخ پر کب اس طرح کے پھول کھلتے ہیں

کلیات نظیر صفحہ ۴۴۴

مسعودہ حیات نے بھی اس اچھوتے موضوع راکھی پر کچھ اشعار کہتے ہیں

ملاحظہ کریں ۔

"راکھی"

اسکے دھاگوں میں دبکے خزانے نہاں

اسکے پھولوں میں دریائے راحت رواں

یہ بہن بھائیوں کی چاہتوں کا نشاں

یہ ہے راکھی کا بندھن میرے بھائیو

صرف بندھن نہیں ایک پیمان ہے

بھائیوں کے دلوں کا یہ ارمان ہے

اپنی بہنوں پہ ہر بھائی قربان ہے

یہ ہے راکھی کا بندھن میرے بھائیو

کی ہمالہ نے رکھشا جو میواڑ کی

دشمنوں کو ہر اک موڑ پر مات دی

رکھشا بندھن ہی کی یہ کرامات تھی

یہ ہے راکھی کا بندھن میرے بھائیو ؎

تصورِ وطن صفحہ ۶۶

باب ۴

وطن اور وطن کے موسمیات اور ہندو دیومالائی (Mythology) کے سبھی خد و خال بالتفصیل بیان کے بعد تقریبات ہند وکا خوش رنگ سلسلہ اس خوبصورت باب سے شروع ہوتا ہے جسمیں بسنت، راکھی، ہولی، دیوالی، اور دسہرہ جیسے ہندو تہذیب کے اہم ترین اجزا، عناصر شامل ہیں۔ ان تمام موضوعات پر اردو شعراء نے بہت دلکش نظمیں، غزلیں اور گیت لکھے ہیں اس سلسلہ کی ایک پرکشش نظم جناب نظیر اکبرآبادی کی پیش خدمت ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

بسنت

ملکہ صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی — ہنس کر کہا یہ ہمنے اے جاں بسنت آئی

سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر — پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی

جب رنگ لائی اس کی پوشاک پر نزاکت — سرسوں کی شاخ ہر گل جلدی سے اک منگائی

اک پنکھڑی اٹھا کر نازک سی انگلیوں میں — رنگت پھر اس کی اپنی پوشاک سے ملائی

جب دم کیا مقابل کسوت سے اپنے اسکو — دیکھا تو اس کی رنگت اس پر ہوئی سوائی

پھر تو بصد مسرت اور سو نزاکتوں سے — نازک بدن پر اپنی پوشاک وہ سجائی

چمپا کا عطر مل کر موتی سے پھر خوشی ہو — سیمیں کلائیوں میں ڈالے کڑے طلائی

بن ٹھن کے اسطرح وہ پھر راہ لی چمن کی — دیکھی بہار گلشن پھر طرب فزائی

جس جس روش کے اوپر جا کر چلی نمایاں — کس کس روش پر اپنی آ کر ادا دکھائی

کیا کیا بیاں ہو جسکی چمکی چمن چمن میں
وہ زرد پوشی اسکی وہ اس کی دلربائی

صد برگ نے صفت کی نرگس نے بے تامل
لکھنے کو وصف اسکا اپنی قلم اٹھائی

پھر صحن میں چمن کے آیا بحسن و خوبی
اور طرفہ تر بسنتی اک انجمن بنائی

اس انجمن میں بیٹھا جب ناز اور ادا سے
گلدستہ اس کے آگے ہنس ہنس بسنت لائی

دیکھ اس کو اور محفل اس کی نظیرؔ ہر دم

کیا کیا بسنت آکر اسوقت جگمگائی

بسنت جیسے جذبات انگیز موضوع پر حضرت امانت لکھنوی کے بھی چند اشعار ملاحظہ کریں۔

ہیں جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی — پوشاک جو پہنے ہے میرا یار بسنتی

کیا فصل بہاری نے شگوفے ہیں کھلائے — معشوق ہیں پھرتے سر بازار بسنتی

گیندا ہے کھلا باغ میں میدان میں سرسوں — صحرا وہ بسنتی ہے یہ گلزار بسنتی

گیندوں کے درختوں میں نمایاں نہیں گیندے — ہر شاخ کے سر پہ ہے یہ دستار بسنتی

رُت پھر گئے عالم میں چلی بادِ بہاری — میخانے میں سجواتے ہیں مے خوار بسنتی

ہر رنگ دو رنگی گلچینوں میں امانت

دو چار گلابی ہوں تو دو چار بسنتی

ادبی نقوش صفحہ ۲۹ شاہ معین الدین

نظیرؔ اکبر آبادی کی ایک دوسری نظم کے چند اشعار اور بھی ملاحظہ کریں

جب پھول کا سرسوں کے ہوا آکے کھلنتا — اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑنتا

پہنے بھی دل اپنے سے تئیں کر کے بجنتا — اور منہ کہیں کہا یار سے اے لکر و بھونتا

سب کی تو بسنتی ہیں یہ یاروں کا بسنتا

اک پھول کا گیندوں کا منگا یار سے بجرا — دس من کا لیا ہار گندھا ہاتھ کا گجرا

جب آنکھ سے سورج کی ڈھلا رات کا گجرا — جا یار سے ملکر یہ کہا اے میرے اجرا

سب کی تو بسنتی ہیں یہ یاروں کا بسنتا

تجھے اپنے گلے میں تو کئی من کے پڑے ہار
اور یار کے گجرے بھی تھے دھون کے منقدار

آنکھوں میں نشے ٹپکے اوبلتے تھے دھواں دھار
جو سامنے آتا تھا یہی کہتے تھے للکار

سب کی تو بسنتیں ہیں یہ یاروں کا بسنتا

پگڑی میں ہماری تھے جو گیندوں کے کئی پیڑ
ہر جھونک میں لگتی تھی بسنتوں کی تئیں ایڑ

ساقی نے بھی مٹکوں کے دیا منھ تئیں بھیڑ
ہر بات میں ہوتی تھیں اسی بات کی آچھیڑ

سب کی تو بسنتیں ہیں یاروں کا بسنتا

خوش بیٹھے ہیں سب شاہ و وزیر آج آہاہا
دل شاد ہیں آج ادنیٰ و فقیر آج آہاہا

بلبل کی نکلتی ہے صفیر آج آہاہا
کہتا یہی پھرتا ہے نظیرؔ آج آہاہا

کلیات صفحہ ۴۳۳

بسنت کے کچھ اور اشعار نظیر اکبر آبادی کے سن لیجیے ۔

"بسنت"

جوش بشاط و عیش ہے ہر جا بسنت کا
ہے طرفہ روزگار طرب زا بسنت کا

باغوں میں لطف نشو نما کی ہیں کثرتیں
نغموں میں خوش دلی افزا بسنت کا

پھرتے ہیں کر لباس بسنتی وہ دلبراں
ہے جن سے زر نگار سراپا بسنت کا

چادر پہ یار کے یہ کہا ہم نے صبح دم
اے جاں ہے اب تو ہر جگہ چرچا بسنت کا

تشریف تم نہ لائے جو کر کے بسنتی پوش
کہیے گناہ ہمنے کیا کیا بسنت کا

سنتے ہی اس پیارے نکلا کہ جسکے تئیں
دل دیکھتے ہی ہو گیا شیدا بسنت کا

اپنا وہ خوش لباس بسنتی دکھا نظیر
چمکا یا حسن یار نے کیا کیا بسنت کا

(کلیات نظیر صفحہ ۳)

راکھی اور بسنت کے بعد اس باب کا سب سے زیادہ خوش منظر نشاط افروز مستی و سرشاری کا جو تہوار عہدِ قدیم سے ابتک سرور انگیز رہا وہ ہولی کا تہوار ہے اس موضوع پر اردو شاعروں نے خوب خوب اپنی جودت طبع کا منظر پیش کیا ہے خود نظیر اکبر آبادی نے اس موضوع ہولی پر دس نظمیں اور غزلیں کہی ہیں اسیطرح بقدرِ ظرف مختلف شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہاں سب کے اظہار خیال کا ذکر ضروری نہیں بلکہ بطور نمونہ بعض بعض کے اشعار ذکر ضرور ہیں اور حسب سابق پہلے نظیر اکبر آبادی کے کلام دلپذیر سے خود کو شاد کام کرلیں ۔

ہولی

ہوا جو آکے نشاں آشکار ہولی کا بجا رباب سے مل کر ستار ہولی کا

سرور و رقص ہوا بے شمار ہولی کا ہنسی خوشی میں بڑھا کاروبار ہولی کا

زباں پہ نام ہوا بار بار ہولی کا

خوشی کی دھوم سے ہر گھر میں رنگ بنوائے گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے

نشوں کے جوش ہوئے راگ رنگ ٹھہرائے جھمکتے روپ کے بن بن کے سوانگ دکھلائے

ہوا ہجوم عجب ہر کنار ہولی کا

گلی میں کوچہ میں غل شور ہو رہے اکثر چھڑکتے رنگ لگے یار ہر گھڑی بھر بھر

بدن میں بھیگے ہیں کپڑے گلال چہرے پر مچی یہ دھوم تو اپنے گھروں میں خوش ہو کر

تماشا دیکھنے نکلے نگار ہولی کا

تمہارے دیکھ کے منھ پر گلال کی لالی ہمارے دل کو ہوئی ہر طرح کی خوشحالی

گھر نے دی ہے مے گلرنگ کی بھری پیالی — جو ہنس دو ہمیں پیارے تم اس گھڑی گالی

تو ہم بھی جانیں کہ ایسا ہے پیار ہولی کا

جو کی ہے تم نے یہ ہولی کی طرفہ تیاری — تو ہنس کے دیکھو ادھر کو بھی جان کی باری

تمہاری آن بہت ہمکو لگتی ہے پیاری — لگا دو ہاتھ سے اپنے جو ایک پچکاری

تو ہم بھی دیکھیں بدن پر سنگار ہولی کا

ادھر سے رنگ لئے آؤ تم ادھر سے ہم — گلال عبیر ملیں منھ پہ ہو کے خوش ہر دم

خوشی سے بولیں ہنسیں ہولی کھیل کر باہم — بہت دلوں سے ارماں تمہارے سر کی قسم

اسی امید میں تھا انتظار ہولی کا

(کلیات نظیر صفحہ ۴۲۵)

نظیر اکبر آبادی کا مشہور ترین خمسہ کے کچھ اشعار ملاحظہ کریں جو شوخی دھینگا مستی اور ناچ رنگ کا ایک اچھوتا سماں پیش کرتا ہے۔

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

خم شیشے جام چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے

پھر بھیگی باہیں ہولی کی کچھ ناز وادا کے رنگ بھرے

دل بھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے

کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے کچھ عیش کے دم منھ چنگ بھرے
کچھ گھونگھروں تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منھ لال گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اس رنگ بھری پچکاری کو انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

وہ دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھکڑ ہو
اس کھینچا کھینچی گھسٹی اوپر بھڑوے رنڈی کا پھکڑ ہو
معجون شرابیں ناچ مزا اور ٹکیا سلفا ککڑ ہو
لڑ بھڑ کے نظیر بھی نکلا ہو کیچڑ میں لتھ پتھ پھکڑ ہو
جب ایسے عیش میسر ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

کلیات نظیر صفحہ ۴۳۷

تبدیلِ ذائقہ کیلئے ضروری ہے کہ اب نظیر اکبر آبادی کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کا بھی کلام ہولی پر پیش کیا جائے آیئے شمالی ہند کا ایک قدیم شاعر فائز جسنے ریختہ میں مثنویاں اور غزلیں کہی ہیں اسکے کچھ پاکیزہ اشعار ہولی پر سنتے جائیں ؎

"ہولی"

آج ہے روزِ بسنت اے اروشی سرو قد ہیں بوستاں کے درمیاں

باغ میں عیش و عشرت رات دن　　گل رُخاں میں ہیں گزرتی جھپنتی ہو

سب کے تن من ہے لباس کیسری　　گرتے ہیں صد برگ پھول سب کیسری

گرتے ہیں صد برگ سوں سب ہم سری　　خوبرو سب بن رہے ہیں لال زرد

چاند جیسا ہے شفق بھیتر نہاں ہو　　چہرہ سب کا گلرنی آتش فشاں

رنگ سوں میں پیرہن سب گل میں لال　　نین ہیں رنگیں کنول سب از گلال

ہر چھبیلی کا لباس کیسری　　تر و تازہ کرتی ہے بہار جعفری

بیٹھ ہنڈولے ناچی گاتی ہنڈول　　ہے گلال سب کرنیں بھبھول ہو

ناچتی گاتی تھہوری دمبدم　　جوں سبھا اندر کی اور باغ ارم ہو

از عبیری رنگ کیسر اور گلال ہو　　ابر چھایا ہے سفید اور زرد لال ہو

جوں جھڑی ہر سو ہے پچکاری کی دھار
دوڑتی ہیں تار باں بجلی کے ساز

انتخاب از کلام فائز۔ مرتب پروفیسر محمد حسن صفحہ ۱۱۱-۱۱۰

مادرِ ہند کا ایک قابلِ قدر سپوت (علی جواد زیدی) جس کی تعبیرِ خوابِ آزادی کے اقدار کی پامالی کے احساس نے زبان شعر میں شعلگی پیدا کر دی ہے۔ اس کی نظم ہولی سنئے جو کافی لمبی نظم ہے ممکن ہوا تو کچھ اشعار قلم انداز بھی کر دیے جائیں گے۔

"ہولی"

پہلے زمانہ اور تھا مے اور تھی دور اور تھا　　دور وفاداری کا یہ انجام تھا

وہ بولیاں ہی اور تھیں　　فکرِ گنہگاری کا تازہ دلربا پیغام تھا

وہ ٹھولیاں ہی اور تھیں
وہ برچھیاں ہی اور تھیں
لیکن مرے پیر مغاں
کل تو نیا انداز تھا
اک دور کا تھا خاتمہ اک دور کا آغاز تھا
تیرے وفاداروں نے جب کھیلیں گلابی ہولیاں
نکلے بنا کر ٹولیاں
ہنستے چلے گاتے چلے
اپنے گلابی رنگ سے دنیا کو نہلاتے چلے
مسجد سے منھ موڑے ہوئے
مندر کا سنگ آستاں چھوڑے ہوئے
گرجا سے کترائے ہوئے
جیسے کہ ہوں رہبانیت کی زندگانی ہی سے گھبرائے ہوئے
شیشوں ہی کے انبار میں اک وہ بھی کہنہ جام ہے
جسکو سکندر کے قوی ہیکل جواں
بھاگے تھے پورس کی زمیں پر چھوڑ کر
ان میں وہ کاسے بھی تو ہیں جنکو عرب لے آئے تھے
اپنی عبا سے ڈھانک کر
پینے سے پہلے دیکھتے تھے محتسب کو جھانک کر

تیرے ہی کوچہ میں یہ سب عہد وفا توڑے گئے
رشتے نئے جوڑے گئے
اور پھر گنہگاروں نے کیا رندانہ ہنگامے کئے
اس وقت انکو یاد تھا بس ایک ترسانا ترا
مفلس وفاداروں کو للچانا ترا
جب میکدے کی گود میں
تیری جفا تیری سزا کے نام پر ساغر چلے
سوکھے ہوئے کاسے لبالب بھر چلے
سب اپنے لب تر کر چلے
پھر توڑ دیں وہ پیالیاں جنمیں سدا پی آئے تھے
شیشے چھنا چھن، چھن چھنا چھن ٹوٹے
اور رند لذت لوٹتے
ٹوٹے ہوئے شیشوں کا اک انبار تھا
جن پہ لکھا ہے یہ بنے تھے ملک انگلستان میں
اور حال کے صدیوں میں یہ چلتے رہے
پینے کو مل جاتی تھی پی لیتے تھے ہم
لیکن تہی دستی کا یہ عالم تھا دل جلتے رہے
اور آج گھبرا ہی گئے
اور ان سبھی شیشوں کو چکنا چور کر ڈالا فورِ جوش میں

لیکن کبھی پینے سے باز آئے نہ تھے فاتح جو تھے | چھن چھنا چھن توڑ کر
وطن میں ہیں ایسے جام بھی | جیسے کہ بربادی کی دیوی چھم چھما چھم ناچتی
جن پر پٹھانوں کے قوی ہاتھوں کے دھندلے نشاں | ہولی منانے کیلئے میخانہ میں آ ہی گئی
کچھ آج بھی موجود ہیں | ٹوٹے ہوئے شیشوں کے اس انبار پر
اور ان نشانوں میں ہے خون مفتوح ہندوستاں کا | ہمنے جلائی آگ یوں
اور ان میں وہ جام بھی جنکو مغل لے آئے تھے | نقشت کا پاکیزہ دل سچائیوں پر ہنس دیا
شیراز سے قندھار سے کابل سے رکناباد سے | جیسے کہ یہ کہنے لگا
مفتوح ہندوستان میں | جلنے دو جلنے دو یونہی شیشے پگھلنے دو یونہی
جنکو وہ اپنے قصر عالیشان میں چھلکاتے رہے | تیرے وفاداروں نے یوں پیر مغاں
تیغوں سے کھنکاتے رہے | شب بھر جلائیں ہولیاں
اور وہ حسین نازک سبک ہلکی صراحی لگی ہے | نعرے وہ سنانے لگے اس جوش میں
پیرس کے میخانے میں یہ مشہور تھی | دل گر پڑے احساس کی آغوش میں
لایا تھا اک تاجر اسے جو بعد میں فاتح بنا | اور یوں اسے تسلیم اے پیر مغاں جاتے ہیں ہم
یہ ہلکے شیشوں کے گلاس اور یہ نہ ہلکے سے پگ | کل پھر پلٹ کر آئیں گے

آر جی صاحب کی نظم ہولی کے بقیہ حصہ کو قلم انداز کرنا پڑا کہ شیشہ و ساغر اور پیرِ مغاں کی آویزش کچھ اور رنگین ہو جائے۔

ہولی جیسے نشاط انگیز تہوار کا ایک حصہ ہولی ملن بھی ہے جب لوگ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور ہولی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

جب کرشن سہگل نے ہولی ملن پر کچھ اشعار کہے ہیں جو سیدھے سادے

الفاظ میں بڑے پرکشش معلوم ہوتے ہیں۔

ہولی کا رنگ اڑاتے ہو ہولی کی شان بھی سمجھو تو
ہر رنگ میں رنگِ محفل ہے ہر رنگ کا راز بھی سمجھو تو
صد رنگی میں بھی یک رنگی ہے طرفہ اندازی بھی سمجھو تو
رگ رگ میں لہو ہے رنگوں کا جیون سندیش بھی سمجھو تو
پھر خون سفید نہ ہو جائے ہولی اپدیش بھی سمجھو تو
جب تک ہے رگوں میں خون رواں تو میری کیا کیا غم گیتی
پیغام خوشی کا لائی ہے لو رس بھنور کی رنگینی
آؤ یہ عہد کریں سہگل اور عہد ہمارا سچا ہو
ہولی کی شان مبارک ہو جو رنگ چڑھا وہ چوکھا ہو (نشاط ک

رادھا کرشن سہگل نے بھی اپنے کلام میں ہند و تہذیب کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے انھوں نے وید اور منتر کو بھی آزاد منظوم کیا ہے وہ اپنی بات بہت ہی سادے اور آسان الفاظ میں کہہ لیے ہیں اب غزل کے اچھے شاعر ہیں لیکن جدید رجحانات کے پیش نظر جدید اندازِ فکر بھی رکھتے ہیں سہگل صاحب نے چند اشعار ہولی پر اوپر دیکھ چکے ہیں اب چند اور اشعار دیوالی پر بھی سنئے۔

(نشاط کرب صفحہ ۴۲

دیوالی

ناچتی گاتی آئی دیوالی دیپ گھی کے جلائے دیوالی

جسکو رستہ کہیں مبارک | کیا تھی ایسی ہائے دیوالی
چہرۂ شب کے دیدۂ روشن | یاد کسی کی لائے دیوالی
بطن ظلمت سے نور ہو پیدا | شادی پائے بجائے دیوالی

لوٹ کے جائے پھر نہ اے سہگل
آئے تو ایسی آئے دیوالی

موجودہ دور کا ایک خوش بیان شاعر جی، آر، کنول، مصنف "شیشہ ٹوٹ جائیگا،، نے بھی ہندو تہوار ہولی اور دیوالی پر نظمیں کہی ہیں پہلے ہولی پر کچھ اشعار سنئے

ہولی

ان سے ملنے کا اک بہانا ہے | ورنہ ہولی میں دلکشی کیا تھی
اپنے دلبر سے چٹکی لینی تھی | ہمکو غیروں سے دل لگی کیا تھی
دل کی دنیا میں رنگ بھرنا تھا | رنگ والوں سے دوستی کیا تھی
مہکا مہکا گلاب تھا اسکا | ورنہ ہولی میں تازگی کیا تھی
آرزو تھی کہ وہ گلے ملتے | اور ہولی میں بات ہی کیا تھی
وہ جو آئے تو بات بن سی گئی | ورنہ ہولی میں زندگی کیا تھی
کوئی پوچھے تو کیا بتائیں کنول | ہمکو ہولی میں بے خودی کیا تھی

جی، آر، کنول صاحب کے ہولی پر کہے ہوئے اشعار سن چکے ہیں اب دیوالی پر بھی ان کی نظم کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

سالہا سال سے دیوالی کی رات آتی ہے
اپنے دامن میں چراغوں کی قطاریں لیکر
حسن پاکیزہ کی عظمت کا تصور لیکر
گلشنِ عشق مقدس کی بہاریں لیکر
سالہا سال صداقت کو ہے پوجا ہیں نے
رام کو اپنے مقدر کا خدا سمجھا ہے
بد دی شیطان کی راون کو ہمیشہ دی ہے
پھر بھی اس گلشن ہستی میں حقیقت کم ہے
ان گنت لوگ اندھیر دل کی قسم کھاتے ہیں
رُخ سیتا پہ جمائے ہوئے نظریں اپنی
شوخ آنکھوں کی اداکاری پہ مرجاتے ہیں

اہل محفل شبِ دیوالی مبارک تمکو!
اپنے سینوں میں مگر دیپ جلاؤگے کب
در و دیوار پہ رونق ہے تمہارے مانا
دل کے آنگن کو مگر بولو سجاؤگے کب

(اور شیشہ ٹوٹ گیا صفحہ ۱۰۹)

اردو کے ایک معروف شاعر جناب دھپت رائے راز لائل پوری نے بھی دیوالی پر ایک مختصر نظم کہی ہے لیکن اس نظم میں انھوں نے اسوقت کا تذکرہ کیا ہے جب رام چندر جی راون کو مار کر گھر لوٹنے کی تیاری سے پہلے سیتا جی کی

اگنی پرکھشا کرائی پھر تمام ساتھیوں کے ساتھ گھر کی طرف واپس ہوئے

اس وقت کا منظر ہی راز صاحب نے منظوم کیا ہے۔

مار راون کو سب راج بھبھکن کو دیا
بھیجا لکشمن کو کہ وہ لے آئیں جو جائے سیتا

سیتا جی آئیں تو لی اگنی پرکھشا انکی
گھر کو تب لوٹنے کی سب اجازت دیدی

سیتا و رام لکھن آپ اجودھیا کو چلے
ساتھ سیگر و ہنومان بھبھکن بھی تھے

یوں تو ہنومان سے بولے کہ تم آگے جاؤ
میرے آنیکی اجودھیا میں خبر پہنچاؤ

کاٹ کر چودہ برس بن سے ہوئے واپس رام
خوش ہوئے جھوم گئے باسی اجودھیا کے تمام

خود بھرت اٹھے سری رام کو لینے کے لئے
کر کے پرنام سری رام کے درشن پائے

دیپ روشن ہوئے ہر گھر میں ہوئی دیوالی
کھل گیا باغ اجودھیا کا جو آیا مالی

(کائنات راز صف)

ہولی کے مشہور تہوار پر جس طرح بیشتر شعراء کرام نے نظمیں

کہی ہیں ان میں جناب الفت ایمن آبادی بھی ہیں انھوں نے "حسن خیال"

کے عنوان سے ہولی کی اچھی منظر کشی کی ہے آپ بھی دیکھیے

حُسنِ خیال

چہرے پہ خط کھنچے نہیں عبیری گلال کے
کیا کیا بنے ہیں حاشیے حسن و جمال کے

نظروں میں جچ رہے ہیں حسین اور بھی حسین
ہولی کے رنگ نور سے نکھرے اجال کے

پچکاریاں نہیں ہیں جوانوں کے ہاتھ میں
لائے ہیں رنگ و روپ کو سانچے میں ڈھال کے

اعلان کر رہی ہے جوانی بہار کا　　گلرنگ دھاریوں کو فضا میں اچھال کے

جوش حیات موسم گل عالم سرور　　وارفتگی کا دور ہے دن ہیں کمال کے

یہ دل لگی یہ چھیڑ یہ مستی یہ راگ رنگ　　حد سے گزر نہ جائے ذرا دیکھ بھال کے

جن گرم جوشیوں سے گلے مل رہے ہیں دوست　　مدت کی رنجشوں کو دلوں سے نکال کے

امڈا ہوا ہے نیاز کا دریائے بے کراں　　اب فاصلے مٹے ہیں فراق و وصال کے

دنیا بہت حسین ہے مگر اس نگاہ میں

اٹھتی ہے ساتھ ساتھ جو حُسن خیال

کلیات راز صفحہ ۱۷۸

رنگ تہذیب کا آئینہ دار تہوار ہولی کی رنگینی سعادت یار خاں رنگین سے بھی سنئے رکھتے ہیں کہ

ہولی

چلتی ہے دو طرف سے پچکاری　　مینہ برستا ہے رنگ کا بھاری

بادل آئے ہیں گھر گلال کے لال　　کچھ کسی کو نہیں کسی کا خیال ٭

وہ جو ہے اپنے کام میں پکی　　لی ہے پچکاری اس نے لبس لگی

یعنی دور اس کی دھار جائے گی　　جسکو چاہے گی یہ بھگا دے گی

ہاتھ میں جسکے وہ ہزارا ہے　　ایک عالم کو اس نے مارا ہے

ہیں جو مصروف سب صغیر و کبیر　　اڑ رہا ہے گلاب اور عبیر

سر کے بالوں کا ہے کسی کو غم　　کوئی ملتی ہے آنکھیں ہر دم ٭

ہے کھڑی کوئی بھر کے پچکاری　　ہے کسی کو کسی نے جا ماری

بھر کے پچکاری وہ جو ہے چالاک　　مارتی ہے کسی کو دور سے تاک

اور اٹھا کر کسی کو بھاری گیند　　کنپٹی میں کسی کی ماری گیند

اور مٹھی میں اپنی بھر کے گلال　　ڈال کر رنگ منھ کیا ہے لال

جسکے بالوں میں پڑ گیا ہے عبیر　　بڑ بڑاتی ہے ہو کے وہ دل گیر

ایسی ہولی کا کیا کہا جائے
کوئی نوج ایسے کھیل میں آئے

(سعادت حسن بار خواں رنگین صفحہ ۲۹۰)

رنگ و نور کے اس موسم میں ایک حرماں نصیب شاعر کے دل میں بھی کتنی شوخی اور رنگینی پیدا ہو جاتی ہے اس کا اندازہ آپ جناب میر صاحب کے ہولی پر کہے ہوئے کچھ اشعار سے لگا سکتے ہیں۔

ہولی

پھر لبالب ہیں آب گیرے رنگ　　اور اڑا ہے گلاب کس کس ڈھنگ

پاس آتے ہیں مرغِ گلشن پھول　　تھے وہ دلبر گلاب جیسے پھول

پگڑیاں جائے بھیگے سروں میں　　ان کو گلہائے تر کہیں تو کہیں

جھڑیاں پھولوں کی دلبروں کیتھا　　سیکڑوں پھول کی جھڑی ہے ساتھ

شیشے بھر کر گلال جو مارے　　مہ وشاں لالہ رخ ہوئے سارے

خوان بھر بھر عبیر لائے ہیں　　گل کی پتی بنا اڑاتے ہیں

لگتی نوروز چند ہولی ہے
راگ رنگ اور ہولی ٹھولی ہے

(ادبی نقوش شبلی اکیڈمی)

جناب محسن کاکوری کے بھائی مولوی احسن کے متصوفانہ انداز کی ایک ٹھمری کے کچھ بول لکھے جاتے ہیں جن کے الفاظ بھاشا کے ہیں۔

ہولی

سانورے یہ کیسی دھوم مچائی

بھری پچکاری یہ کیسر رنگ کی — بھرت ہیں چھتر کھلاڑی

ابرا گلال بھرکے جھورن میں — چھڑکت سب نرناری

بچت ناہیں اپنی پرائی ″ ″

بہیاں پکڑ کے رنگ میں بورت — گیسو ہے کنور کنھائی

راعب کا ہو گرد الگائے — اب تو دیرج مان نہ آئی

ہوت ہے سب کی رسوائی

کہت گوالن میری تمہرے — چرن سیس نوائی ″ ″

اپنا رنگ برساوجن پر — ایسی جگدیو بنائی

بہت سون لگائی ″ ″

عین الحق خاں ناشاد اورنگ آبادی نے بھی اس رنگین تہوار پر کچھ رنگین اشعار لکھے ہیں۔

ہولی

ہولی ہے آج یارو آو خوشی منائیں — ہولی ملن کا ملکر ہم سب ہی گیت گائیں

چھوٹا بڑا نہ کوئی ہیں آج سب برابر — ہو دوست یا کہ دشمن سب کو گلے لگائیں

آئی ہے سال بھر پہ لیکر ہزاروں خوشیاں — سارے دکھوں کو اک دن ہم بھول کیوں نہ جائیں
ہے بام پر کھڑی وہ زلفیں کئے پریشاں — ایسے میں ڈر ہے زاہد پی کر لہک نہ جائیں
ساری ہے کیسری تو چولی کا رنگ دھانی — ناشاد دل پہ بجلی کیوں کر نہ وہ گرائیں (پرداز سخن صفحہ ۲)

سودہ حیات کی ایک گیت ہولی سے متعلق رنگینی بکھیرتی ہوئی چند بند پر مشتمل ہے ملاحظہ کریں۔

ہولی

گلی گلی بازار میں ہو گئی رنگوں کی بوچھار — ہندو مسلم سکھ عیسائی ملکر کھیلیں ہولی
آنچل بھیگے تن من بھیگا گال ہوئے گلنار — آج کے دن سب بھاؤ بنا کر بولیں میٹھی بولی
کتنی امنگیں لے کر آیا ہولی کا تہوار... منظر ہو گئے رنگیلے — سنے ہولی کے رنگوں سے دلکی کالک دھولی
رنگوں سے غبارے بھر کر اونچے چڑھے اناری — آیا ہولی کا تہوار لیکر رنگوں کی بہار
سبزہ سبزہ رنگ میں ڈوبا بھیگی داڑھی ڈاڑھی
کوئی نہ پوچھے ان سے بابا پنڈت ہو کہ پجاری — آیا ہولی کا تہوار لیکر رنگوں کی بہار
منظر ہو گئے رنگیلے۔

ہولی کی رنگینی اور اس کے شوخ و رنگین مناظر کے بارے میں گذشتہ ابواب میں بہت کچھ لکھے جا چکے ہیں اب دیوالی کے تہوار پر بھی نگاہ ڈالنی چاہئیے دیوالی ہندوؤں کا ایک مذہبی اور مقدس تہوار ہے روشنی کے اس تہوار میں ہندو گھروں میں لکشمی کی پوجا ہوتی ہے جو ہندوؤں کی دیوی ہے جسکا تعلق دھن و دولت سے ہے اس دن پورا ملک روشنی میں ڈوب جاتا ہے۔ اس پاکیزہ تہوار میں کچھ غلط رسمیں بھی جہالت کی وجہ سے شامل ہو گئی ہیں مثلاً اس روز قمار بازی

اور شراب خوری کی آزادی چونکہ تہوار کا تعلق لکشمی جی سے ہے اسلئے اردو شعراء نے دیوالی پر خوب نظمیں کہی ہیں۔ سب سے پہلے مسعودہ حیات،، کی دیوالی پر نظر ڈالی جائے۔

،، دیوالی،،

اسی موضوع پر مسعودہ حیات کے چند اور اشعار سن لیجئے۔۔

آئی دیوالی آئی دیوالی گیت خوشی کے گاؤ   اندھیرے کو دور کر دو تم گھر گھر دیپ جلاؤ (تصور)

سیتا رام کی راہوں کو اب پھولوں سے مہکاؤ   چودہ برس پر لوٹے گھر کو لچھمن سیتا رام

آج ہر اک نر ناری کے لب پر ہے انھیں کا نام

دلہن کے مانند سجے ہیں مندر اور شوالے   پوجا کا سامان سجائے آئے ہیں متوالے

دیا دھرم کا درن کرینگے آج یہاں دل والے   چودہ برس میں گھر کو لوٹے لچھمن سیتا رام

آج ہر اک نر ناری کے لب پر ہے انھیں کا نام

بازاروں میں لگا ہوا ہے دیوالی کا میلہ   کوئی خریدے برتن کپڑے کوئی شال دوشالہ

کوئی خریدے آتش بازی کوئی گلوں کی مالہ   چودہ برس میں گھر لوٹے لکشمن سیتا رام

ہندوستان کے ایک ممتاز مشہور اردو شاعر نے بھی دیوالی پر ایک فکر انگیز آزاد نظم لکھی ہے ہے

دیوالی

وقار روح کے تاروں کو کیوں چھوا تم نے
تمہاری نظم دیوالی بہت ہی اچھی ہے
مگر یہ رات کی گردن میں دیپ مالائیں

سیاہیوں میں اجالوں کے بدنما دھبے

غریب حبشی کو جیسے جذام ہو جائے... یہ ٹمٹمائے دیئے

یہ ٹمٹمائے دیئے صبح کا بدل تو نہیں

یہ ٹمٹمائے دیئے لکشمی کے چرنوں میں

سبھی نے حسنِ عقیدت کے پھول ڈالے ہیں

وہ جنکو لکشمی دیوی سے قرب حاصل ہیں

گھروں میں اپنے بھی دیپک جلائے بیٹھے ہیں

شکستہ جھونپڑیوں کو سجائے بیٹھے ہیں

کہ اسطرح بھی عنایت کی اک نظر ہو جائے... مگر وہ بھولتے ہیں

شکستہ جھونپڑوں ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں

کبھی لکشمی دیوی نہ مسکرائے گی

کبھی بہار نہ ان کے چمن میں آئیگی

اگر وہ خود ہی نظامِ چمن نہ بدلیں گے

(غلام ربانی تاباں)

دیوالی کے سلسلے کی آخری نظم نظیر اکبرآبادی کی پیش کیجاتی ہے۔

دیوالی

دوستو کیا کیا دیوالی میں نشاط و عیش ہے — سب مہیا ہے جو اس ہنگام کے شایاں شے

اسطرح ہیں کوچہ و بازار پر نقش و نگار — ہو عیاں حسن نگارستاں کی جن سے خوب ہے

اگرم جوشی اپنی یا جام چراغاں لطف سے   کیا ہی روشن کر رہی ہے ہر طرف روغن کی لے

مائل سیر چراغاں نخل ہر جا دم بدم ؛   حاصل حسنِ نظارہ شمع رویاں پے بہ پے

عاشقاں کہتے ہیں معشوقوں سے با عجز و نیاز   ہے اگر منظور کچھ لینا تو حاضر ہیں روپے

گر مکرر عرض کرتے ہیں تو کہتے ہیں وہ شوخ   ہم سے لیتے ہو یہاں تکرار و حجت تا بہ کے

کہتے ہیں اہل قمار آپس میں گرم اختلاط   ہم تو ڈب میں سو روپیہ رکھتے ہیں تم جیتے سو کے

جیت کا پڑتا ہے جسکا داؤ وہ کہتا ہے یوں   سوئے دست راست ہے میرے کوئی فرخندہ پے

ہے دسہرے میں بھی یوں گو فرحت و زینت نظیر
پر دِوالی بھی عجب پاکیزہ تر تہوار ہے ؛ ؛

دسہرہ

ہندوؤں کا مقدس تہوار ہے۔ سری رام چندر جی جب لنکا فتح کر کے اودھ لوٹے تو ان کی آمد کی خوشی میں دسہرے کی تقریب نہایت جوش خروش سے منائی گئی اور یہی تقریب ایک مقدس تہوار بن گئی۔ ہندو مسلم شعراء نے اس اہم موضوع پر نظمیں کہی ہیں۔

جناب نوبت رائے نظرؔ نے بھی اس مبارک تقریب کو فتح و نصرت کی علامت اور یادگار عظمت ہندوستاں سمجھکر نظم کہا ہے کچھ اشعار ملاحظہ کریں۔

ہے دسہرہ یادگارِ عظمتِ ہندوستاں
ہندوؤں کی ایک قومی فتح و نصرت کا نشاں

اک مٹی سی یہ نشانی دولت و اقبال کی
یاد دلواتی ہے ان ایامِ فرخ فال کی

جبکہ تھی ہم میں بھی ایسی زور و طاقت کی نمود
ہیچ تھی دیوان روشن تن کی جس سے ہست و بود

جب اکیلے اٹھ کھڑے ہوتے تھے ہم بہرِ نبرد
اور کر دیتے تھے اپنے دشمنوں کو گرد برد

دل میں ہمت ہاتھ میں رہتے فقط تیر و کماں
لشکرِ کفار میں جس سے تھا شورِ الاماں

باندھ وہ پل سمندر کو کیا ہمنے عبور
جسکو حیراں آجتک ہیں دیکھکر اہلِ شعور

فوج راون تھی بقدرِ ریگِ صحرا کی طرح
اور امنڈ آتی تھی وقتِ جنگ دریا کی طرح

وہ دلاور صف شکن وہ کوہ پیکر اسکے دیو
جسکی خونخواری کا ہوتا تھا زمانے میں غریو

قلعہ وہ لنکا کا جو ناقابلِ تسخیر تھا
جس پہ نازاں اپنے دلمیں راون بے پیر تھا

تھے طلائی برج جسکے اور مرصع بام و در
جسکی چوٹی تک نہ پہنچے کوئی مرغِ تیز پر

معدن لعل و زمرد تھی جہاں کی خاک بھی
اک طلسم ایسا کہ قاصر تھا جہاں ادراک بھی

ہمنے ایسے دشمنوں پر فتح پائی تھی کبھی
اپنے حصے میں بھی یہ معجز نمائی تھی کبھی

آج وہ دن ہے کہ ہم اس یاد کو تازہ کریں
روئے زیبائے عروس فتح پر غازہ کریں

مل کے گائیں رام کے گن دلیں ہو جوش سرور
قلب صادق مخزن حسرت ہو شیشہ رشک طور

یہ دسہرہ عشرۂ عشرت ہے اپنے واسطے
خالق کونین کی رحمت ہے اپنے واسطے

مرثیہ

اردو زبان کی شاعری میں مرثیہ گوئی کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے اس صنف سخن میں ہندو مسلمان دونوں ہی نے واقعہ کربلا کے المناک اور رقت انگیز حالات کو بڑے پر سوز انداز میں نظم کیا ہے۔، مسلم شعرا میں جسطرح مرثیہ گو شعرا کی فہرست طویل ہے اسی طرح ہندو مرثیہ گو شعرا کی تعداد کچھ کم نہیں مجاور حسین اردو مرثیہ کے غیر مسلم شعرا صفحہ ۱۲۴ سے ۱۳۴ تک واقعہ کربلا کے سلسلہ میں ڈاکٹر مجاور حسین رضوی کہتے ہیں کہ عالمی تاریخ کا یہ منفرد واقعہ اس جنگ کا تصور پیش کرتا ہے جہاں اعلیٰ ترین اخلاقی اصول اور نظریات خیر و حق شر اور باطل کی قوت متصادم تھی چنانچہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے تقاضوں کے مطابق مجاور حسین ہندو مرثیہ گو شعرا کے نام گناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے غیر مسلموں میں رام راو کا نام ملتا ہے جو گولکنڈہ کے قطب شاہی امیر تھے لیکن ان کے کلام کا نمونہ نہیں ملتا۔

دوسرا شاعر داس ہے ان کے کلام کا نمونہ ملاحظہ کیجیے ؎ صفحہ ۱۲۹

مظلوم ہو گیا ہے جہاں سوں وہ شہسوار
شہ کے دکھوں میں داس کے ہیں چشم اشکبار
روتا ہے یوں دریغ میتی زار زار زار ؎
مارے ہیں ظالموں نے نبی کے رتن کو آج

اسی عہد کا ایک شاعر سر کہ ہے اسکا ذکر اور کلام کا نمونہ بھی یورپ میں دکنی مخطوطات میں ملتا ہے ان کا ایک شعر سنیے ؎

ماہ محرم گہن بیرن کا شور ہوا شب غم کا

جگ میں غم پرگٹ ہوا پایا نگ بڑا ماتم کا

دکن میں مالک جی، اتر میک جی، نانک، ذرہ کے بارے میں سفارش حسین کی نشاندہی کے بعد کالی داس گپتا رضا نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

دکن کے غیر مسلم مرثیہ گو شعرا کی ایک طویل فہرست بن سکتی تھی لیکن مرثیہ کے ہیئت کے تعین کے بعد ان کے یہاں سلام و رباعی تو ہے لیکن باضابطہ مرثیہ مہاراجہ کشن پرشاد کے یہاں ہی ملتا ہے ان کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

پہلے مسلم کو کیا قتل مسلمانوں نے

ہائے کیا ظلم کیا جان کے نادانوں نے

گھر کو برباد کیا گھر کے نگہبانوں نے

قافلہ لوٹ لیا مل کے حدی خوانوں نے

کمر اب ٹوٹ گئی شاہ کی طاقت نہ رہی

جب ہراول نہ رہا فوج کی شوکت نہ رہی

بیسویں صدی کے قابل ذکر مرثیہ نگار شعرا میں نانک چند نانک شری متی ادیب کنور، دلو رام کوثری اور ڈاکٹر نتھونی لال وحشی منظفر پوری کے نام لیے جا سکتے ہیں ان میں نانک چند کے مرثیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ صفحہ ۱۳۴

عصر حاضر کے غیر مسلم مرثیہ گو شعرا کے بارے میں سید محمود نقوی نے ایک لمبی فہرست پیش کی ہے جن کے چند مشہور نام یہ ہیں، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، گرسرن لال ادیب دواکر راہی، شام سنگھ حمار، سیشور پرشاد منور لکھنوی،

گوپی ناتھ امن، کرشن بادی نور، وشوناتھ پرشاد ناتھ لکھنوی پروفیسر جاوید وششٹ داس سنگھ، وکل، پنڈت رگھوناتھ سہائے امیر وغیرہ کنور مہندر سنگھ بیدی کا یہ مشہور قطعہ اکثر محرم کی مجالس میں سوز خوانوں سے سنا جاتا ہے آپ بھی سنئے۔

زندہ اسلام کو کیا تو نے۔ حق و باطل دکھا دیا تو نے

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے مر کے جینا سکھا دیا تو نے

ابتک تو ہمنے ہندو مرثیہ گو شعرا کے کلام اور ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے لیکن مسلم مرثیہ گو شعرا کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے حالانکہ اس اہم صنف سخن میں انیس و دبیر کا ذکر ضرور چاہیے تھا جو محتاج تعارف بھی نہیں اور جنھوں نے اس فن کو بام عروج تک پہونچا دیا ہے۔

الغرض مشترکہ تہذیب کے عوامل شعر و شاعری زبان و ادب نظام معاشرہ رزم و بزم اور زندگی کے ہر شعبوں میں گھل مل گئے ہیں چنانچہ گلزار دہلوی مرثیہ گوئی میں قومی یکجہتی کے اشتراک کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ "حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کے اور سعی سے جو اردو زبان کا خمیر اٹھا اسے مکمل گنگا جمنی سیکولر) تہذیب انیس و دبیر اور ان کے معاصرین کے مرثیوں ہی نے بنایا جس سے قومی یکجہتی کے نقشے میں رنگ آمیزی ہوئی

حرفِ ناتمام

کسی ملک کے تہذیبی حالات جاننے کیلئے وہاں کا نظام معاشرہ رسم و رواج مذہب و عقیدہ، مقدس کتابیں ان کے تراجم، طبعی اور جغرافیائی حالات مذہبی اہم شخصیتیں، تعلیم و تعلم رسومات و موسمیات، آثار قدیمہ وغیرہ سب پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے ورنہ کلّی طور پر تہذیبی عناصر بمشکل روشنی میں آسکیں گے

ہمارا ملک ہندوستان جو مختلف اقوام کا گہوارہ اور مختلف تہذیبوں کا نمائندہ رہا ہے ابھی کل کی بات ہے جب یہاں دولت اسلامیہ کا تسلط تھا، ہندو مسلم دونوں قوموں کے آپس کے میل جول اور گہرے تعلقات کے ذریعہ اظہار گفتگو اور ایک دوسرے کو سمجھنے کیلئے ایک ملی جلی نئی زبان پیدا ہوئی سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد یہی زبان ہندو مسلم کی مشترک تہذیبی علامت بن گئی اور اپنی شیرین بیانی اور ندرتِ الفاظ کی بنا پر پورے ملک کی عوامی زبان کی حثیت اختیار کر گئی لیکن افسوس صد افسوس ہندوستان کی آزادی کے بعد ہی لسانی تعصب نے اُردو زبان کی بنیاد ہلا کر رکھدی اور ہمارے اکابرین نے جس اردو زبان کو صدیوں کی محنت کے بعد ہندوستان کا مشترک سرمایۂ تہذیب بنا دیا تھا، دشمنان ملک نے اسکے تار و پود بکھیر کر رکھدیا۔

یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں بلکہ ملک و قوم کیلئے ایک خطرہ کا حامل ہے کیوں کہ اس ضرر رساں انقلاب سے اب ہندو شعراء اردو شعراء کی صف

سے نکلتے جا رہے ہیں اور ہندؤں میں اردو زبان کے شاعر پیدا نہیں ہوتے بلکہ اردو داں ہندو بھی بمشکل مل سکیں گے اور اردو کے موجودہ شعراء جو بقیدِ حیات ہیں وہ لوگ بھی چراغ سحری کی طرح جھلملانے لگے ہیں

دنیا کی ایک بہترین شیرینِ بیاں اور نرم ونازک الفاظ سے مزین زبان اردو جو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی بڑھی، پھولی، پھلی اسے غیر ملکی زبان کی تہمت دیکر اسکا وجود ختم کرانے کی کوشش جاری ہے۔ تو کیا اس ملک میں اب کوئی نئی زبان اس دھرتی پر پیدا ہو کر پنپ سکتی ہے؟

نہیں۔ ہرگز نہیں

اندکے پیش تو گفتم و لے می ترسیدم ؎

کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اثر انصاری

اثرؔ انصاری کی تصانیف اور تعارف

اثرؔ انصاری بیسویں صدی کے نصف اول میں ابھرنے والے شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے اب تک پانچ شعری مجموعے اور تین نثری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ کم وکیف، افکار پریشاں، زبان غزل اور پیراہن گل ان کی منتخب غزلوں کے مجموعے ہیں اور " آئینہ درآئینہ " نظموں کا مجموعہ ہے، ان کی نثری تصانیف میں "سفرجج کے شب و روز" تذکرہ سخنوران مئو اور دبستان شبلی کے نامور انشاپرداز شامل ہیں۔

کم وکیف

سال اشاعت ۱۹۷۴ء

پیشکش :- دانشکدہ اردو لائبریری مئوناتھ بھنجن

یہ اثرؔ انصاری کا اولین شعری مجموعہ ہے جس میں بقول شاعر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک کی منتخب غزلیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں کل اٹھہتر (۷۸) غزلیں اور سترہ قطعات شامل ہیں۔ اس کتاب پر اترپردیش اردو اکادمی نے ۱۹۷۵ء میں انعام سے نوازا ہے۔

افکار پریشاں

سال اشاعت ۱۹۸۰ء

ناشر :- نکھار پبلی کیشنز مئوناتھ بھنجن

افکار پریشاں اگرچہ اثرؔ انصاری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کی غزلیں شامل ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اثرؔ انصاری کے تخلیقی سفر میں

اس کی حیثیت پہلی منزل کی سی ہے۔ جیسا کہ خود اثر انصاری اس کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں۔

"پہلی کتاب "کم و کیف" ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکی ہے جس میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۲ء تک کے منتخب کلام شامل ہیں لیکن در حقیقت انکار پریشاں ہی میری پہلی تصنیف ہے جس میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک کے منتخب کلام شامل ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اشاعت کی تقدیم و تاخیر کی اس غلطی میں میرے ناپختہ جذباتی شعور کا دخل تھا"[1]

اثر انصاری آگے لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مجموعۂ کلام سے جو (۱۹۶۰ء میں ترتیب دیا گیا تھا) نظموں کا کل حصہ نکال دیا گیا ہے اور بعد کی کچھ غزلیں شامل کر دی گئی ہیں جو ابتدائی صفحات پر دیکھی جا سکتی ہیں"[2]

"انکار پریشاں" میں اثر انصاری کا ایک مختصر پیش لفظ اور پروفیسر سید احتشام حسین کا تعارف بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ میں کل ایک سو گیارہ غزلیں شامل ہیں۔ اثر انصاری کے تخلیقی سفر کا جائزہ لینے سے قبل افکار پریشاں اور کم و کیف کی اشاعتی تقدیم و تاخیر کو دھیان میں رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کے تخلیقی سفر کا تعین مشکل ہوگا۔

افکار پریشاں پر بھی یوپی اردو اکادمی نے اپنے انعام سے نوازا ہے اس کے علاوہ نکھار ادبی ایوارڈ (گولڈ میڈل) سے بھی سرفراز ہوئے ہیں۔

---

[1] [2] اثر انصاری۔ افکار پریشاں (پیش لفظ) ص ۱۹۲

سفرِ حج کے شب و روز

سالِ اشاعت ۱۹۷۹ء
ناشر:- نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن

"سفرِ حج کے شب و روز" اثرؔ انصاری کی اولین نثری تصنیف ہے جو دراصل ان کے سفرِ حج کا سفرنامہ ہے جس میں انھوں نے ایامِ حج کے حالات و تاثرات اور واقعات کو بہت ہی شگفتہ اور دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

تذکرہ سخنورانِ مئو

سالِ اشاعت ۱۹۸۱ء
ناشر:- نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن

یہ مئو ناتھ بھنجن کے شعراء کا تذکرہ ہے جس میں پانچ صفحات پر مشتمل ایک تمہید جو مئو کے ادبی ماحول کے تعلق سے لکھی گئی ہے اس کے علاوہ دو صفحات کا پیش لفظ بھی ہے کتاب میں اکیاون (۵۱) شعراء کے حالاتِ زندگی، نمونۂ کلام اور ان پر مصنف کے تاثرات ہیں۔ یہ کتاب مئو کی علمی و ادبی تاریخ میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اثرؔ انصاری کی نثرنگاری کی دوسری منزل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر دانشکدہ اردو لائبریری نے آپ کو "ہلالِ دانش" کا اعزاز عطا کیا ہے۔

زبانِ غزل

سالِ اشاعت ۱۹۸۷ء
تقسیم کار:- نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک سے شائع ہونے والے اس تیسرے شعری مجموعہ میں ۱۹۷۲ء کے بعد کی غزلوں کا انتخاب شامل ہے جو کل اکسٹھ غزلوں پر مشتمل ہے۔ زبانِ غزل کی غزلوں میں کم و کیف اور افکارِ پریشاں کے مقابلے میں زیادہ پختگی اور نکھار ہے جو اثرؔ انصاری کے ذہنی و فکری ارتقا کی علامت ہے۔

اس کتاب پر بھی اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام عطا کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اثر انصاری کی مجموعی ادبی خدمات پر "امتیاز میر" کا گراں قدر انعام بھی عطا ہوا ہے۔

دبستانِ شبلی کے نامور انشار پرداز

سالِ اشاعت سنہ ۱۹۹۰ء
تقسیم کار۔ نکھار پبلی کیشنز مئوناتھ بھنجن

فخر الدین میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک سے شائع ہونے والی یہ کتاب اثر انصاری کے نثری سفر کی تیسری منزل ہے جس میں دبستان شبلی کے نامور انشار پرداز جیسے علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر نجیب اشرف، شاہ معین الدین اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے حالات زندگی اوران کے علمی، ادبی اور تصنیفی کارناموں کا تذکرہ محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب جہاں دبستان شبلی کے انشار پردازوں کی انشار پردازی کا تعارف پیش کرتی ہے وہیں مصنف کی شگفتہ نثر نگاری کا دلکش نمونہ بھی سامنے آجاتا ہے۔

آئینہ در آئینہ

سالِ اشاعت۔ سنہ ۱۹۹۲ء
تقسیم کار:۔ نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن

فخر الدین میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک سے شائع ہونیوالا یہ اثر انصاری کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اثر انصاری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اوران کے بقول اس مجموعہ میں ۱۹۴۲ء سے اب تک کی منتخب نظمیں شامل ہیں۔ جس میں ایک نعت پاک اور اڑتالیس نظمیں ہیں جن میں مختلف موضوعات پر مشتمل تیس نظمیں ہیں۔ بارہ مختلف شخصیات پر

ہیں اور چھ نظمیں مختلف تعلیمی اداروں کے بارے میں ہیں۔ اس کتاب پر
بھی اردو اکادمی یوپی نے اپنے انعام سے اثر انصاری کو نوازا ہے۔

پیراہنِ گُل

سال اشاعت ۱۹۹۶ء

تقسیم کار۔ نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن۔

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی اشتراک
سے شائع ہونے والا اثر انصاری کی غزلوں کا چوتھا مجموعہ کلام ہے، جس میں
حمد و نعت کے علاوہ کل اناسٹھ غزلیں ہیں۔ "پیراہنِ گل" کی غزلیں آپ کی
سابقہ غزلوں کے مقابلے فنی اور شعری اعتبار سے کافی پختہ اور دلکش ہیں جو شاعر
کے تخلیقی ارتقا کی مظہر ہیں۔